ماہنامہ

اشراق

لاہور

جون ۲۰۲۳ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”خدا زیادہ دیتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ اُس کی بنیاد پر حق و باطل کے فیصلے کیے جائیں، بلکہ اِس لیے کہ اُس کے بخشے ہوئے رزق کو اُس کی خوشنودی کے لیے اُس کی راہ میں خرچ کیا جائے کہ یہی شکر کا تقاضا ہے۔“

—— قرآنیات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشرو اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگی قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۵ شمارہ ۶ جون ۲۰۲۳ء ذوالقعدہ ۱۴۴۴ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 100 روپے
سالانہ 1000 روپے
رجسٹرڈ 1500 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 50 ڈالر

فہرست

شذرات

گالی کا جواب: گالی، شکایت یا خاموشی؟ — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: سبا ۳۴: ۲۲-۳۹ (۳) — جاوید احمد غامدی — ۸

مقالات

''میزان''— توضیحی مطالعہ: حدود و تعزیرات (۲) — محمد عمار خان ناصر — ۱۵

محبت رسول: اہمیت اور تقاضے — محمد ذکوان ندوی — ۲۶

نقطۂ نظر

والدینیت کے زعم میں والدین کی کوتاہیاں — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۴۱

سوال کیسے اٹھایا جائے؟ — خورشید احمد ندیم — ۴۵

سیر و سوانح

مہاجرین حبشہ (۲۰) — محمد وسیم اختر مفتی — ۴۸

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

سید منظور الحسن

گالی کا جواب: گالی، شکایت یا خاموشی؟

گالی کے پیرائے میں حق بات بھی تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ بے علم کو جاہل کہا جائے تو اُسے برا لگتا ہے۔ نشہ کرنے والا اور چوری کرنے والا نشئی یا چور کہلانا پسند نہیں کرتا۔ پھر گالی اگر جھوٹ پر مبنی ہو اور اُس میں تضحیک و تذلیل بھی شامل ہو جائے تو حد درجہ اذیت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین و اخلاق میں اِسے ایک مسلمہ برائی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مذاہب اور معاشرے اِسے رذائل اخلاق میں شامل کرتے اور اِس سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اصل مسئلہ گالی کے جواب کا ہے۔ اگر کوئی شخص دشنام تراشتا، بہتان لگاتا اور تمسخر اڑاتا ہے تو اُس کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

اِس ضمن میں تین طرح کے رویے اختیار کیے جاتے ہیں:

اول، ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب میں بھی گالی دی جائے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہم معاملے کو اپنی ذات کی عدالت میں لے آئے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

دوم، مدافعت کرتے ہوئے زیادتی کی شکایت پیش کی جائے۔

اس کا مطلب ہے کہ ہم معاملے کو لوگوں کی عدالت میں لے گئے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں ہمیں دی گئی گالی زبان زدعام ہو جاتی ہے۔

سوم، برداشت کرتے ہوئے خاموش رہا جائے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔

اِس کا مطلب ہے کہ ہم معاملے کو اللہ کی عدالت میں لے گئے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں زیادتی کرنے والا شرمندہ ہو کر معافی کا طلب گار بن جاتا ہے یا بہ صورتِ دیگر قیامت میں سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

قرآنِ مجید کی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی روشنی میں تیسرا رویہ ہی قابل اعتبار اور لائق ترجیح ہے۔ سورۂ حجرات میں ارشاد فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ.(۴۹:۱۱)

”ایمان والو، نہ (تمھارے) مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو برے القاب دو۔ (یہ سب فسق کی باتیں ہیں، اور) ایمان کے بعد تو فسق کا نام بھی بہت برا ہے۔ اور جو (اِس تنبیہ کے بعد بھی) توبہ نہ کریں تو وہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔“

سورۂ حج میں حکم دیا ہے:

فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ. وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ. اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ.(۲۲:۶۷-۶۹)

”سو اِس معاملے میں وہ تمھارے ساتھ ہرگز کوئی جھگڑا نہ کرنے پائیں۔ لہٰذا نظر انداز کرو اور اپنے پروردگار کی طرف بلاتے رہو۔ یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔ اِس کے بعد بھی اگر وہ تم سے جھگڑنے کے درپے ہوں تو اِن سے کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے، جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ قیامت کے دن تمھارے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کر دے گا، جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔“

احادیث میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک شخص حضرت ابو بکر صدیق

رضی اللہ عنہ کو مسلسل گالیاں دے رہا تھا۔ حضرت ابو بکر بالکل خاموش تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی خاموشی پر مطمئن تھے۔ جب وہ حد سے بڑھ گیا تو حضرت ابو بکر نے بھی کچھ جواب دے دیا۔ اِس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اطمینان باقی نہ رہا اور آپ تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکر کو تشویش ہوئی اور اُنھوں نے اِس کا سبب پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک تم خاموش تھے، اللہ کا فرشتہ تمھارے ساتھ تھا اور تمھاری طرف سے اُسے جواب دے رہا تھا۔ جیسے ہی تم بولے تو وہ فرشتہ چلا گیا اور شیطان داخل ہو گیا (مسند احمد، رقم ۹۶۲۴)۔

اِس سے واضح ہے کہ الزامی دشنام طرازی کے ساتھ ساتھ جوابی دشنام طرازی بھی دین و اخلاق میں نامقبول ہے۔

المیہ یہ ہے کہ اِن میں سے کوئی کام اگر رہنماؤں اور پیش واؤں سے صادر ہو جائے تو عام طور پر اُس کی کوئی تاویل یا توجیہ پیش کر کے اُسے محمود یا کم از کم جائز قرار دیا جاتا ہے۔ اِس مقصد کے لیے بالعموم یہ دلائل دیے جاتے ہیں:

اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے،

باطل کا سر اِسی طرح کچلنا چاہیے،

یہ عام انسانی رویہ ہے،

یہ حق کی حمیت کا اظہار ہے،

یہ لوگوں کے جذبات کی ترجمانی ہے،

یہ ادبا کا شعار ہے،

ہجو گوئی اور ہزل سرائی تو زبان و بیان کی مسلمہ اصناف ہیں۔

اِس طرح کے دلائل پر امام امین احسن اصلاحی کا ایک نوٹ پیش خدمت ہے۔ اِسے اُنھوں نے سورۂ حجرات کی مذکور بالا آیت کے الفاظ 'وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ' کی تفسیر میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ' کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر برے القاب چسپاں کرنا ہے۔ اچھے القاب سے ملقب کرنا جس طرح کسی فرد یا قوم کی عزت افزائی ہے، اُسی طرح برے القاب کسی پر چسپاں کرنا اُس کی انتہائی توہین و تذلیل ہے۔ ہجو یہ القاب لوگوں کی زبانوں پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں اور اُن کا اثر نہایت دور رس اور نہایت پایدار ہوتا ہے۔ اُن کی پیدا کی ہوئی تلخیاں پشت ہا پشت تک باقی رہتی ہیں اور اگر معاشرے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں یہ ذوق اتنا ترقی کر جائے کہ ہر گروہ کے شاعر، ادیب، ایڈیٹر اور لیڈر اپنی ذہانت اپنے حریفوں کے لیے برے القاب ایجاد کرنے میں لگا دیں تو پھر اُس قوم کی خیر نہیں ہے۔ اُس کی وحدت لازماً پارہ پارہ ہو کے رہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دورِ جاہلیت میں عربوں کے اندر یہ ذوق بدرجۂ کمال ترقی پر تھا۔ قبیلہ کا سب سے بڑا شاعر اور خطیب وہی مانا جاتا، جو دوسروں کے مقابل میں اپنے قبیلہ کے مفاخر بیان کرنے اور حریفوں کی ہجو و تحقیر میں یکتا ہو۔ اُن کے ہجویہ اشعار پڑھیے تو کچھ اندازہ ہو گا کہ اِس فن شریف میں اُنھوں نے کتنا نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ اُن کی اِس چیز نے اُن کو کبھی ایک قوم بننے نہیں دیا۔ وہ برابر اپنوں ہی کو گرانے اور پچھاڑنے میں لگے رہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے اُن کو انسانی وحدت اور ایمانی ہم آہنگی سے آشنا کیا، جس کی بدولت وہ دنیا کی ہدایت و قیادت کے اہل بنے۔ قرآن نے یہاں اُن کو دورِ جاہلیت کے اِنھی فتنوں سے آگاہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایمان و اسلام کی برکات سے نوازا ہے تو اُس کی قدر کرو۔ شیطان کے ورغلانے سے پھر اُنھی لاف زنیوں اور خاک بازیوں میں نہ مبتلا ہو جانا، جن سے اللہ نے تمھیں بچایا ہے۔‘‘

(تدبر قرآن ۷/ ۵۰۷)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ سبا

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ
ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ
قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾

اِن سے کہو کہ ذرا بلاؤ اُنھیں جن کو تم نے خدا کے سوا معبود سمجھ رکھا ہے۔[۵۲] وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر اختیار رکھتے ہیں نہ زمین میں، اور نہ اِن دونوں کے بنانے میں اُن کا کوئی ساجھا ہے اور نہ (اِس کائنات کا نظم چلانے کے لیے) اُن میں سے کوئی خدا کا مددگار ہے۔ اُس کے حضور کوئی شفاعت کام نہیں آتی، الاّ یہ کہ وہ خود کسی کے لیے اُس کی اجازت دے۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن جب اُن کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو تمھارے یہی معبود ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ تمھارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا؟ وہ جواب دیں گے کہ حق ارشاد ہوا اور وہ عالی مقام ہے،

۵۲۔ یعنی بلاؤ کہ ہم بھی اُن کی صورت دیکھیں، وہ کیسے اور کہاں ہیں؟

قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ ۙ وَاِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ
لَعَلٰی ہُدًی اَوۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۴﴾ قُلۡ لَّا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّاۤ اَجۡرَمۡنَا وَلَا
نُسۡـَٔلُ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۵﴾ قُلۡ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفۡتَحُ بَیۡنَنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَہُوَ

بڑی عظمت والا ہے۔[۵۳] ۲۲-۲۳

اِن سے پوچھو، تمھیں زمین اور آسمانوں[۵۴] سے کون روزی بہم پہنچاتا ہے؟ کہو، اللہ۔[۵۵] اب ہم میں اور تم میں کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گم راہی میں، (اِس کا فیصلہ خدا ہی کے سپرد ہے)۔[۵۶] اِن سے کہو، نہ ہمارے کسی جرم کی تم سے کوئی پرسش ہونی ہے اور نہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اُس کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے گا۔ کہو، ہمارا پروردگار ہم سب کو (ایک دن) اپنی عدالت

۵۳۔ سورہ کے مخاطب چونکہ قریش ہیں اور وہ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر اُن کی پرستش کرتے تھے، اِس لیے یہ اُنھی فرشتوں کا ماجرا ہے کہ آگے بڑھ کر ناز و تدلل کے ساتھ کسی کی سفارش کرنا تو الگ رہا، دوسرے سب لوگوں کی طرح اُن میں سے بہتوں پر بھی ایسا ہول طاری ہو گا کہ اُنھیں کچھ خبر نہ ہو گی کہ کیا ہوا اور اُن کے پروردگار نے اِس کے دوران میں کیا فرمایا ہے۔

۵۴۔ زمین کے ساتھ آسمان کا ذکر اِس لیے کیا ہے کہ پانی آسمان سے برستا، سورج آسمان پر چمکتا اور تمام موسمی تغیرات آسمان ہی سے پیدا ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں زمین سے بیج اگتے، سبزہ لہلہاتا اور فصلیں بہار دکھاتی ہیں۔

۵۵۔ قرآن کے مخاطبین یہ بات چونکہ مانتے تھے، اِس وجہ سے قرآن نے سوال کرنے کے بعد اُس کا جواب بھی خود ہی دیا اور بات آگے بڑھا دی ہے۔

۵۶۔ یعنی جب ہم اور تم، دونوں خدا ہی کو رازق مانتے ہیں تو آگے جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، وہ اُس کا بدیہی نتیجہ ہے۔ اِس کے بعد بھی بحث کرنا چاہتے ہو تو تمھارا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ وہی فیصلہ کرے گا کہ ہم میں سے کون حق پر ہے اور کون گم راہی میں پڑا ہوا ہے، اِس پر اب کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس طرح کی بات، ظاہر ہے کہ اُسی وقت کہی جاتی ہے، جب مخاطب دھاندلی پر اتر آئے اور اپنے مسلمات کے بدیہی نتائج کو بھی ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔

الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿٢٦﴾
قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٧﴾
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

کے لیے جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان بالکل انصاف کے مطابق فیصلہ کر دے گا۔ وہی بہت بڑا فیصلہ کرنے والا اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۲۴-۲۶

اِن سے کہو، ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی جنھیں تم نے شریک بنا کر خدا سے ملا رکھا ہے۔[۵۷] ہرگز نہیں، بلکہ وہی اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ۲۷

(یہ نہیں سنتے تو ہم دوسروں کو مخاطب بنالیں گے)۔ ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو جو بھیجا ہے تو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے،[۵۸] لیکن (لوگوں پر

۵۷۔ یہ تہدید و وعید اور طنز و تحقیر کا اسلوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخر وہ کون اور کہاں ہیں جو ایسے عالی مقام اور صاحب حکمت ہیں کہ خدا کی خدائی میں اُس کے ساجھی بنا دیے گئے ہیں؟ یہ آخر میں اُسی مضمون کو دوسرے اسلوب میں ادا کر کے بات ختم کر دی ہے جس کی ابتدا آیت ۲۲ سے ہوئی تھی۔

۵۸۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ دوسرے رسولوں کی طرح آپ کی بعثت محض اپنی قوم کی طرف نہیں، بلکہ تمام خلق کی طرف ہوئی ہے۔ اپنی قوم کے اعیان و اکابر کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھ کر آپ نے اِسی بنا پر اوس و خزرج کے لوگوں کو دعوت دی اور اُن کے بعد اہل کتاب اور اپنے گردوپیش کے حکمرانوں کو بھی۔ اِس کے نتیجے میں جو لوگ ایمان لائے، یہ اُنھی کی مدد تھی جس سے عالمی سطح پر اتمام حجت کا اہتمام ممکن ہوا اور نبوت و رسالت کا منصب ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اب اِس دعوت کا ابلاغ اُس امت کی ذمہ داری ہے جو نسلاً بعد نسلٍ اُنھی انصار کے تابعین اور تبع تابعین کی حیثیت سے دنیا میں موجود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لوگوں کو بھی خدا نے یہ سعادت عطا فرمائی کہ بعد میں اُن کی بڑی اکثریت ایمان لا کر اُس منصب کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئی جسے قرآن میں ذریت ابراہیم کا منصب شہادت کہا گیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۹﴾ قُلۡ لَّکُمۡ
مِّیۡعَادُ یَوۡمٍ لَّا تَسۡتَاۡخِرُوۡنَ عَنۡہُ سَاعَۃً وَّلَا تَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۰﴾

وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ بِہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَلَا بِالَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ ؕ وَلَوۡ
تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ مَوۡقُوۡفُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚۖ یَرۡجِعُ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضِۣ الۡقَوۡلَ ۚ
یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لَوۡلَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا

افسوس ہے کہ) اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۵۹] کہتے ہیں کہ اگر تم لوگ سچے ہو تو عذاب کا یہ وعدہ کب پورا ہوگا (جس کی دھمکی سنا رہے ہو)؟ اِنھیں بتا دو کہ تمھارے لیے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس سے نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹو گے، نہ آگے بڑھو گے۔[۶۰] ۲۸-۳۰

یہ منکرین کہتے ہیں کہ ہم اِس قرآن کو کبھی نہ مانیں گے اور نہ اُس کو جس کی یہ آگے خبر دے رہا ہے۔[۶۱] اور اگر تم دیکھتے، جب یہ ظالم اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہوں گے، اِس طرح کہ اِن میں سے ایک دوسرے پر بات ڈال رہا ہوگا، پھر تم دیکھتے کہ یہ کس انجام کو پہنچے ہیں۔[۶۲] جو لوگ دبا کر رکھے گئے تھے،[۶۳] اُس وقت وہ اپنے متکبرین سے کہیں گے کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو (پیغمبر کی

۵۹۔ یعنی اِس بات کو نہیں جانتے کہ اُن کے لیے یہ کتنی بڑی محرومی ہے اور اِس کے نتائج کتنے سنگین ہوں گے۔

۶۰۔ مطلب یہ ہے کہ آخر کس برتے پر عذاب کا وقت معلوم کرنا چاہتے ہو؟ کیا جانتے نہیں ہو کہ وہ جب آئے گا تو کسی کے ٹالے ٹل نہ سکے گا۔

۶۱۔ یعنی عذاب اور عذاب کے بعد قیامت۔

۶۲۔ اِس مفہوم کے الفاظ اصل میں حذف کر دیے گئے ہیں۔ جواب شرط کا یہ حذف عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ہے اور اُن موقعوں پر کیا جاتا ہے، جہاں صورت حال کی ہول ناکی تعبیر و تصویر سے ماورا ہو جائے۔

۶۳۔ یعنی غربا اور عوام جو اپنی غربت اور بے مائگی کے سبب سے ہمیشہ اپنے بڑوں اور سرداروں کے آلۂ کار

مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ
عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ
اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ
اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ
وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿٣٣﴾

بعثت کے بعد حق اِس قدر واضح ہو گیا تھا کہ) ہم ایمان لے آئے ہوتے۔ اِس کے جواب میں متکبرین اُنھیں جو دبا کر رکھے گئے، کہیں گے: کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا، اِس کے بعد کہ وہ تمھارے پاس آگئی تھی؟ ہرگز نہیں، بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔ دبے ہوئے لوگ متکبرین کو جواب دیں گے: بلکہ تمھاری دن رات کی چالیں تھیں جو یہاں تک لے آئی ہیں، جب کہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور اُس کے شریک ٹھیرائیں۔[٦٤] (پھر) جب عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو دلوں میں پچھتائیں گے۔[٦٥] (مگر اُس وقت پچھتانے سے کیا حاصل)! ہم اِن منکروں کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔[٦٦] یہ وہی بدلہ پائیں گے جو کرتے رہے تھے۔ ۳۱-۳۳

بنتے رہے ہیں۔

٦٤۔ اِس توتکار سے واضح ہے کہ دونوں جانتے بوجھتے حق کا انکار کرتے رہے۔ وہ نہ لیڈروں پر مخفی تھا اور نہ اُن کے پیرووں پر، اِس لیے کہ خدا کے رسول نے اُن پر حجت تمام کر دی تھی۔

٦٥۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا کوئی عذر مسموع نہ ہو گا اور اُنھیں عذاب کے آگے پیش کر دیا جائے گا۔ اُس وقت دلوں میں پچھتائیں گے کہ اپنے ضمیر کی گواہی کے خلاف ہم نے اپنے لیڈروں کی پیروی کی اور بالآخر اِس انجام کو پہنچ گئے۔

٦٦۔ یہ سزا اِس جرم کی پاداش میں ہو گی کہ دنیا میں دوسروں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے رہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ
كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾
قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا
زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۫ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا
عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾
وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

(یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اے پیغمبر)، ہم نے جس بستی میں بھی کوئی خبردار کرنے والا بھیجا ہے، اُس کے اغنیا نے یہی کہا کہ جو تم دے کر بھیجے گئے ہو، ہم اُس کو نہیں مانیں گے۔ اور کہا کہ ہم مال و اولاد میں تم سے بڑھ کر ہیں اور ہم پر کوئی عذاب بھی آنے والا نہیں ہے۔ اِن سے کہو، حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار ہی جس کے لیے چاہتا ہے، روزی کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[67] (خدا کے بندو)، تمھارے مال اور تمھاری اولاد وہ چیز نہیں ہے جو تم کو ہمارا مقرب بنا دے۔ البتہ جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، وہی ہیں کہ جن کے لیے اُن کے عمل کا کئی گنا[68] صلہ ہے اور وہ بالاخانوں میں اطمینان سے بیٹھے ہوں گے۔ ۳۴-۳۷

اور جو نیچا دکھانے کے لیے ہماری آیتوں کے جھٹلانے میں سرگرم ہیں،[69] وہ پکڑے ہوئے عذاب

۶۷۔ یعنی اِس بات کو سمجھتے نہیں ہیں کہ یہ صبر و شکر کا امتحان ہے جو خدا نے اِس طریقے سے برپا کر رکھا ہے، بلکہ اِس کی بنیاد پر حق و باطل کے فیصلے کرنے لگتے ہیں۔

۶۸۔ اصل میں ’جَزَآءُ الضِّعْفِ‘ کے الفاظ ہیں۔ یہ مثل کے لیے بھی آتا ہے اور کسی چیز کے امثال کے لیے بھی۔ اِس کو دگنے اجر کے محدود مفہوم میں لینا ضروری نہیں ہے۔

۶۹۔ اصل الفاظ ہیں: ’يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ‘۔ اِن میں ’فِيْ‘ کے بعد مضاف محذوف ہے۔ ہم

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ
مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٣٩﴾

میں داخل کیے جائیں گے۔[۷۰] ۳۸

کہہ دو، میرا پروردگار ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے، رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ اُس کی راہ میں جو چیز بھی تم خرچ کرو گے، وہ اُس کا بدلہ دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔[۷۱] ۳۹

نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۷۰۔ اِس میں ذلت اور بے بسی کی جو تصویر ہے، وہ ظاہر ہے۔

۷۱۔ مطلب یہ ہے کہ خدا زیادہ دیتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ اُس کی بنیاد پر حق و باطل کے فیصلے کیے جائیں، بلکہ اِس لیے کہ اُس کے بخشے ہوئے رزق کو اُس کی خوشنودی کے لیے اُس کی راہ میں خرچ کیا جائے کہ یہی شکر کا تقاضا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ وہی بات جو اوپر کہی گئی تھی، یہاں کس مقصد سے دہرائی گئی ہے۔ دونوں جگہ، اگر غور کیجیے تو تمہید ایک، لیکن مدعا الگ الگ ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

[باقی]

محمد عمار خان ناصر

”میزان“ ــــ توضیحی مطالعہ

حدود و تعزیرات

(۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حدود کی تنفیذ کا اختیار

”اِن کی سزا کا حکم مسلمانوں کو اُن کی انفرادی حیثیت میں نہیں، بلکہ پورے مسلمان معاشرے کو دیا گیا ہے اور اِس لحاظ سے اُن کے نظم اجتماعی سے متعلق ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کا حکم ہی قرآن کی اُن سورتوں میں بیان ہوا ہے جو اُس وقت نازل ہوئی ہیں جب یثرب کا اقتدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی ایک باقاعدہ حکومت وہاں قائم ہو گئی تھی۔ چنانچہ کوئی شخص یا جماعت اگر کسی خطۂ ارض میں سیاسی اقتدار نہیں رکھتی تو اُسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ اِن میں سے کوئی سزا کسی مجرم پر نافذ کرے۔“ (میزان ۶۱۲)

مصنف نے یہاں فقہا کے متفقہ موقف کی ترجمانی کی ہے، جس کی رو سے معاشرتی جرائم کے ارتکاب پر مجرم کو سزا دینے کا اختیار افراد کو نہیں، بلکہ نظم اجتماعی، یعنی ریاستی اداروں کو حاصل ہے۔ فقہا کا یہ اتفاق عقل عام کے اس اصول پر مبنی ہے کہ اگر اس نوعیت کے معاملات میں ہر شخص کو ازخود اقدام کرنے کا حق دے دیا جائے تو یہ چیز معاشرتی اور قانونی نظم کو درہم برہم کر دے گی اور اس کے نتیجے میں انصاف اور ظلم کے مابین عملاً کوئی فرق کرنا ہی سرے سے ممکن ہی نہیں رہے گا۔ جلیل القدر حنفی فقیہ علامہ کاسانی نے اس ضمن میں بعض اہم

مصالح کو نمایاں کیا ہے جو اولوالامر کے بجاے عام لوگوں کو سزا کے نفاذ کا اختیار سونپنے سے فوت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ قاضی کو ریاستی مشینری کی پوری معاونت حاصل ہوتی ہے اور وہ مجرم کی طرف سے معارضے یا جوابی کارروائی کے خدشے سے بے نیاز ہو کر سزا نافذ کر سکتا ہے، جب کہ کسی عام فرد کو دوسرے فرد پر یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا اور اس کا امکان ہوتا ہے کہ وہ سزا کے نفاذ کی مزاحمت کرے گا یا انتقاماً اپنے مخالف کی جان ومال کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ مزید برآں قاضی کے حق میں مجرم کے لیے رعایت، جانب داری اور مداہنت کے دواعی عموماً نہیں پائے جاتے، جس کی وجہ سے وہ انصاف اور قانون کے تقاضوں کے مطابق سزا کو نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جب کہ کسی مقدمے کے فریق کے بارے میں نہ صرف یہ کہ اس کا امکان، بلکہ ظن غالب ہے کہ وہ عدل وانصاف کے مطابق فیصلہ کرنے کے بجاے جانب داری کا مرتکب ہوگا (بدائع الصنائع ۷/ ۵۷-۵۸)۔

ایک روایت میں ہے کہ سعد بن عبادہ نے ایک موقع پر زنا کے مجرم کو خود ہی قتل کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غیرت کی تعریف فرمائی، لیکن ساتھ ہی کہا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کسی کو یہ بات پسند نہیں کہ مجرم کو صفائی پیش کرنے یا اپنی براءت ثابت کرنے کا موقع دیا جائے (بخاری، رقم ۶۹۸۰)۔

امام ابن عبد البر اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

في هذا الحديث النهي عن قتل من هذه حاله تعظيمًا للدم وخوفًا من التطرق إلى إراقة دماء المسلمين بغير ما أمرنا الله به من البينات أو الإقرار الذي يقام عليه وسد باب الافتيات على السلطان في الحدود التي جعلت في الشريعة إليه وأمر فيها بإقامة الحق على الوجوه التي ورد التوقيف به..... والمعنى الموجود في هذا الحديث مجتمع عليه قد نطق به الكتاب المحكم وقد وردت به السنة

”اس حدیث میں ایسی حالت میں قتل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے تاکہ انسانی جان کی حرمت کو نمایاں کیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے گواہوں یا مجرم کے اقرار کی بنیاد پر سزا نافذ کرنے کا جو طریقہ مقرر کیا ہے، اس سے ہٹ کر مسلمانوں کا خون بہانے کا راستہ نہ کھل جائے۔ اس سے حکمران کے دائرۂ اختیار میں مداخلت کا سد باب بھی مقصود ہے، کیونکہ شریعت میں سزائیں نافذ کرنے کا اختیار حکمران ہی کے سپرد کیا گیا ہے اور اسے ان ہدایات کے مطابق سزا نافذ کرنے کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الثابتة واجتمعت عليه الأمة.

(التمہید ۲۱/ ۲۵۳، ۲۵۵)

حکم دیا گیا ہے، جو شریعت میں بیان کیے گئے ہیں۔ ...اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ متفق علیہ ہے۔ یہ بات قرآن نے بھی بیان کی ہے، سنت ثابتہ سے بھی ثابت ہے اور امت کا بھی اس پر اجماع ہے۔‘‘

البتہ مصنف نے اس میں ایک استثنا قرآن مجید کی روشنی میں قصاص کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ قاتل کو سزا میں کوئی رعایت دینے کے ضمن میں مقتول کے اولیا کی رضامندی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

’’تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ حکومت اگر کسی جگہ قائم نہ ہو اور قصاص کا معاملہ مقتول کے اولیا ہی سے متعلق ہو جائے تو وہ اپنی اِس حیثیت میں حدود سے تجاوز کریں۔‘‘ (میزان ۶۲۱)

یہ استثنا مصنف نے سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۳۳ سے اخذ کیا ہے، جس میں مقتول کے وارثوں کو قاتل سے انتقام لینے کا حق دیا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں جب مسلمانوں کا اقتدار اور حکومت قائم نہیں ہوئی تھی تو قبائلی رواج کے مطابق ہر شخص کو اپنا بدلہ خود لینے کی اجازت تھی، لیکن ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جب مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی تو از خود ایسا کوئی اقدام کرنے سے انھیں روک دیا گیا۔ فرماتے ہیں:

ومن انتصر لنفسه دون السلطان فهو عاص مسرف قد عمل بحمية الجاهلية ولم يرض بحكم الله.

(السنن الکبریٰ، رقم ۱۵۸۵۹)

’’جو شخص حکمران کے پاس جائے بغیر اپنا انتقام خود ہی لے، وہ گناہ گار اور حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ اس نے جاہلیت کی حمیت پر عمل کیا ہے، لیکن اللہ کے فیصلے پر راضی نہیں ہوا۔‘‘

موت کی سزا

’’موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں نہیں دی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کو شریعت دی گئی تو اُسی وقت لکھ دیا گیا تھا کہ اِن دو جرائم کو چھوڑ کر، فرد ہو یا حکومت، یہ حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور اُسے قتل

کر ڈالے۔''(میزان ۶۱۲)

مصنف کا نقطۂ نظر یہاں بعض اہم حوالوں سے اہل علم کی عمومی راے سے مختلف ہے۔

قتل کی سزا کی تحدید کے ضمن میں فقہا کے ہاں سورۂ مائدہ کی محولہ آیت زیر بحث نہیں لائی جاتی، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک حدیث کے ضمن میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ کیا موت کی سزا کچھ خاص جرائم تک محدود ہے یا نہیں۔ عبد اللہ بن مسعود کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کی جان لینا اس کے علاوہ حلال نہیں کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا شادی شدہ ہونے کی حالت میں زنا کیا ہو یا دین سے نکل کر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے (بخاری، رقم ۶۸۷۸)۔ تاہم ان کے علاوہ متعدد دیگر جرائم کے لیے بھی موت کی سزا بیان کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جن میں سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کرنا (ترمذی، رقم ۱۲۸۲)، کسی محرم خاتون کے ساتھ بدکاری (ترمذی، رقم ۱۴۶۲)، زنا بالجبر (ابوداؤد، رقم ۴۳۷۹۔ ترمذی، رقم ۱۴۵۴)، لواطت (المستدرک، رقم ۸۰۴۹۔ ترمذی، رقم ۱۴۵۵)، شراب نوشی کا عادی مجرم ہونا (ابوداؤد، رقم ۴۴۸۲۔ ۴۴۸۴) اور شراب نوشی ترک کرنے سے انکار کرنا (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۳۷۴۲) شامل ہیں۔ ان تمام مثالوں میں موت کی سزا مسلمانوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح جب بعض کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور زبان درازی کی پاداش میں قتل کر دیا گیا تو آپ نے ان کے خون کو رائگاں قرار دے دیا (ابوداؤد، رقم ۳۷۹۵۔ نسائی، رقم ۴۰۰۲۔ ابن ابی عاصم، الدیات ۱/۷۳)۔ ان تمام نظائر کی روشنی میں جمہور فقہا مذکورہ حدیث میں مذکور تین جرائم کے علاوہ بھی کسی جرم میں تعزیری طور پر موت کی سزا دینے کو درست سمجھتے ہیں۔

مصنف نے اس سوال کو مذکورہ حدیث کے بجاے سورۂ مائدہ کی محولہ آیت کے تناظر میں موضوع بنایا ہے جہاں بنی اسرائیل کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ قتل اور فساد فی الارض کے علاوہ کسی ایک انسان کی جان لینا گویا ساری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ اس نقطۂ نظر کی رو سے نہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں، بلکہ شریعت موسوی میں بھی قتل کی سزا اسی صورت میں دی جا سکتی تھی جب مجرم یا تو قتل ناحق کا مرتکب ہوا ہو یا اس کا جرم فساد فی الارض کے تحت آتا ہو۔ یوں مصنف کے سامنے نہ صرف ان احادیث میں مذکور ان واقعات کی توجیہ کا سوال ہے، جن میں مختلف مجرموں کے لیے سزاے موت تجویز کی گئی ہے، بلکہ وہ حدیث بھی توجیہ طلب بن جاتی ہے جس میں قتل کے علاوہ شادی شدہ زانی اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو

جانے کو بھی مستوجب قتل قرار دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ تورات میں مذکور ان تمام مثالوں کی توجیہ بھی ضروری ہو جاتی ہے جن میں ناحق قتل (گنتی ۳۵: ۱۶-۲۱) کے علاوہ متعدد جرائم پر موت کی سزا مقرر کی گئی ہے، مثلاً کسی آزاد کو غلام بنا کر بیچنا (استثنا ۲۴: ۷)، شادی شدہ عورت یا کسی کی منگیتر کے ساتھ بدکاری (استثنا ۲۲: ۲۲-۲۴)، قاضی کے سامنے گستاخی کرنا یا اس کا فیصلہ نہ ماننا (استثنا ۱۷: ۱۲-۱۳)، باپ کے سامنے سرکشی اور اس کی نافرمانی (استثنا ۲۱: ۱۸-۲۱)، باپ یا ماں پر لعنت کرنا (احبار ۲۰: ۹)، کہانت کی خدمت میں بنی لاوی کے ساتھ شریک ہونے کی کوشش کرنا (گنتی ۱۸: ۷)، لواطت (احبار ۲۰: ۱۳)، جانور کے ساتھ جماع (احبار ۲۰: ۱۵-۱۶)، اپنی بہن یا بھائی کے بدن کو بے پردہ دیکھنا (احبار ۲۰: ۱۷)، خدا کے علاوہ کسی اور معبود یا سورج یا چاند یا اجرام فلکی کی عبادت (استثنا ۱۳: ۱-۱۸، ۱۷: ۲-۷)، اولاد کو مولک کی نذر کرنا (احبار ۲۰: ۲)، خدا کے نام کی بے حرمتی کرنا (احبار ۲۴: ۱۳-۱۶)، نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنا (استثنا ۱۸: ۲۰-۲۲)، سبت کے دن کی پابندی کو توڑنا (گنتی ۱۵: ۳۲-۳۶)، اور سفلی عمل یا جادو کرنا (احبار ۲۰: ۲۷) وغیرہ۔

مصنف نے مختلف مقامات پر ان میں سے بعض مثالوں کی جو توجیہ و تعبیر کی ہے، اس سے ان کا زاویۂ نظر سمجھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تورات میں شادی شدہ خاتون کے ساتھ زنا کو مستوجب قتل قرار دینے کی توجیہ مصنف نے یوں کی ہے کہ ”بنی اسرائیل کی مخصوص حیثیت اور اُن پر خدا کی براہ راست حکومت کی وجہ سے زنا بہ زن غیر (adultery) کو اُن کی شریعت میں حرابہ قرار دے دیا گیا تھا۔ عورت کنواری ہو تو البتہ، رعایت کی ہدایت کی گئی تھی اور مرد پر مالی تاوان عائد کر کے اُسے پابند کر دیا گیا تھا کہ باقی عمر کے لیے وہ اُسے بیوی بنا کر رکھے گا“ (البیان ۳/ ۴۱۶)۔ اس توجیہ سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مصنف کے نزدیک، خدا کی شریعت کا حامل ہونے اور خدا کے ساتھ اس کی پابندی اور اقوام عالم کے سامنے اس کی شہادت کا عہد و میثاق باندھنے کے بعد مذکورہ جرائم کا ارتکاب بنی اسرائیل کے حق میں اللہ تعالیٰ کے خلاف محاربہ اور اس کی شریعت سے سرکشی کا درجہ رکھتا تھا، جس پر ان کے لیے موت کی سزا مقرر کی گئی۔

جہاں تک حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور جرائم، یعنی مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جانے اور شادی شدہ ہوتے ہوئے زنا کرنے کا تعلق ہے، تو مصنف ان کو بھی حرابہ کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ ان میں سے مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جانے سے مراد مصنف کے نزدیک نظم اجتماعی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے خلاف بغاوت کرنا ہے، جو واضح طور پر فساد فی الارض کی مثال ہے، جب کہ شادی شدہ کے لیے قتل کی سزا کا ذکر اس پہلو سے کیا گیا ہے کہ زنا کے بعض مجرموں کو بھی ان کے جرم کی نوعیت اور شخصی حالات کے لحاظ سے فساد فی الارض کا مرتکب قرار دیا جا سکتا ہے۔ مصنف کے نزدیک مجرم کا شادی شدہ ہونا، سزا کی واحد بنیاد نہیں، بلکہ بعض صورتوں میں دیگر کئی پہلوؤں کے ساتھ مل کر ایک ایسا قابل لحاظ پہلو بن جاتا ہے جس پر مجرم کو فساد فی الارض کا مرتکب قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی نوعیت کی توجیہ مصنف نے احادیث میں منقول واقعات میں سے توہین رسالت کے مجرموں کو قتل کرنے سے متعلق بیان کی ہے۔ ان کی راے میں اگر کوئی غیر مسلم معاند مستقل طور پر یہ روش اختیار کر لے اور تنبیہ و تادیب کے باوجود اصلاح پر آمادہ نہ ہو تو اسے محاربہ اور فساد فی الارض کا مجرم قرار دے کر موت کی سزا بھی دی جا سکتی ہے اور عہد نبوی میں جن مجرموں کو یہ سزا دی گئی، ان کے جرم کی نوعیت یہی تھی۔

حاصل یہ ہے کہ مصنف کے نقطۂ نظر کے مطابق سورۂ مائدہ کی زیر بحث آیت کی رو سے موت کی سزا کے لیے کسی جرم کا 'فساد فی الارض' کا مصداق ہونا ضروری ہے اور تورات میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں جن جرائم پر بھی سزاے موت دی گئی، وہ اس کا مصداق تھے۔ مصنف کی ذکر کردہ توجیہات سے کسی جرم کے فساد فی الارض کے تحت شمار ہونے کے جو اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ بعض جرائم، مثلاً بغاوت، ڈاکا زنی اور زنا بالجبر وغیرہ نظم اجتماعی اور امن عامہ کو براہ راست منہدم کرنے کی وجہ سے فساد فی الارض کے تحت آتے ہیں۔

۲۔ بعض میں مجرم کا رویہ اور ناقابل اصلاح روش ان جرائم کو فساد کا مصداق بنا دیتی ہے، جیسے شراب نوشی، زنا اور توہین رسالت وغیرہ کو مستقل معمول بنا لینا اور توبہ و اصلاح کی طرف مائل نہ ہونا۔

۳۔ بعض جرائم کو مجرموں کی مخصوص حیثیت کی وجہ سے فساد فی الارض کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے، جیسے وہ مختلف جرائم جن کو تورات میں بنی اسرائیل کے لیے مستوجب قتل قرار دیا گیا ہے، مثلاً کسی شادی شدہ عورت سے بدکاری یا کسی آزاد کو غلام بنا کر بیچ دینا۔

۴۔ اسی ضمن میں بنی اسرائیل کی سرکشی کی پاداش میں ان کے لیے زیادہ سنگین سزائیں مقرر کیے جانے کو بھی ایک مستقل اصول شمار کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید نے حلال اور حرام جانوروں کے تعلق سے بعض پابندیوں کی یہ نوعیت تو تصریحاً واضح کی ہے، جب کہ احکام شریعت کی پامالی پر بہت سی صورتوں میں سزاے موت مقرر کیے جانے کو بھی اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ بعض جرائم اس پہلو سے سرکشی اور محاربہ کا مصداق ہیں کہ ان میں شریعت کی بعض ایسی حدود کو پامال کیا جاتا ہے جن کو عام حالات میں کوئی پامال کرنے کی جسارت نہیں کرتا اور ان کی پامالی، شریعت اور حدود اللہ سے متعلق مجرم کے باغیانہ ذہنی رویے کا اظہار کرتی ہے، مثلاً سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح یا کسی محرم خاتون سے بدکاری کرنا وغیرہ۔

محاربہ اور فساد فی الارض

''اللہ کا رسول دنیا میں موجود ہو اور لوگ اُس کی حکومت میں اُس کے کسی حکم یا فیصلے کے خلاف سرکشی اختیار کر لیں تو یہ اللہ و رسول سے لڑائی ہے۔ اِسی طرح زمین میں فساد پیدا کرنے کی تعبیر ہے۔ یہ اُس صورت حال کے لیے آتی ہے، جب کوئی شخص یا گروہ قانون سے بغاوت کر کے لوگوں کی جان و مال، آبرو اور عقل و رائے کے خلاف برسر جنگ ہو جائے۔ چنانچہ قتل، دہشت گردی، زنا، زنا بالجبر اور چوری ڈاکا بن جائے یا لوگ بدکاری کو پیشہ بنا لیں یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئیں یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن جائیں یا نظم ریاست کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں یا اغوا، تخریب، ترہیب اور اِس طرح کے دوسرے سنگین جرائم سے حکومت کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیں تو وہ اِسی فساد فی الارض کے مجرم ہوں گے۔'' (میزان ۶۱۳)

مصنف نے یہاں حرابہ اور فساد فی الارض کے مفہوم و مصداق سے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ فقہا اور مفسرین نے بالعموم محاربہ کا مصداق راہ زنی اور ڈکیتی کو قرار دیا ہے۔ تاہم جلیل القدر تابعی مفسر مجاہد سے یہ رائے منقول ہے کہ آیت حرابہ میں مذکور 'فساد فی الارض' کے دائرے میں چوری، زنا، قتل اور حرث و نسل کی بربادی وغیرہ بھی شامل ہیں (طبری، جامع البیان ۶/ ۱۳۲)۔ امام قرطبی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اللّٰهُمَّ إلا أن يريد إخافة الطريق بإظهار السلاح قصدًا للغلبة على الفروج فهذا أفحش المحاربة وأقبح من أخذ الأموال وقد دخل في معنى قوله تعالىٰ: ﴿وَيَسۡعَوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ فَسَادًا﴾. (احکام القرآن ۷/ ۴۴۴)	''اگر مجاہد کی مراد عورتوں کی عصمت دری کے لیے ہتھیاروں کے بل بوتے پر غنڈہ گردی کرنا ہے تو یقیناً یہ محاربہ کی بدترین صورت ہے، جو بدمعاشی کے زور پر لوگوں کے مال لوٹنے سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ یہ صورت یقیناً اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہے کہ ''جو لوگ زمین

میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں۔‘‘

دور جدید کے اہل علم کے ہاں بھی آیت حرابہ کو معاشرے اور ریاست کے خلاف جرائم کے وسیع تر تناظر میں دیکھنے کا رجحان نمایاں ہے اور وہ قانون کو ہاتھ میں لینے، ریاست کے اختیار اور اتھارٹی کو چیلنج کرنے، معاشرے کے امن وامان کو درہم برہم کرنے اور جان ومال اور آبرو کے حوالے سے خوف وہراس کی صورت حال پیدا کر دینے کی ہر صورت کو اس کے مفہوم میں داخل مانتے ہیں۔ چنانچہ علامہ رشید رضا لکھتے ہیں کہ جان ومال اور آبرو کے خلاف عام نوعیت کے جرائم اگر جتھابندی کی صورت میں کیے جائیں، جس سے 'فساد فی الارض' کی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ 'حرابہ' کے تحت آ جاتے ہیں (تفسیر المنار ۲۹۶/۶)۔

مولانا حمید الدین فراہی کے نزدیک سیدنا عمر کے نجران کے نصاریٰ کو سود کھانے کی بنا پر جزیرۂ عرب سے جلاوطن کرنے کا ماخذ بھی آیت محاربہ ہے، کیونکہ اس میں فساد فی الارض کی سزا بیان ہوئی ہے اور سود بھی اسی کی ایک صورت ہے (تفسیر نظام القرآن، البقرہ ۲۸۵)۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کے مفہوم میں 'زنا' کی بعض صورتوں کو بھی شامل قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک ''وہ گنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کے عزت وناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، جو اغوا اور زنا کو پیشہ بنا لیں، جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت وآبرو پر ڈاکے ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں، ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے'' (تدبر قرآن ۵۰۶/۲)۔ مولانا کی رائے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عکل اور عرینہ کے لٹیروں اور بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع کے یہود کے خلاف، جب کہ صحابہ نے مسیلمہ کذاب اور مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ اور خیبر کے یہود کو جزیرۂ عرب سے جلاوطن کرنے کے جو اقدامات کیے، ان سب کا ماخذ بھی یہی آیت ہے (تدبر قرآن ۵۰۷/۲)۔

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

''...اکثر مفسرین نے اس جگہ رہزنی اور ڈکیتی مراد لی ہے، مگر الفاظ کو عموم پر رکھا جائے تو مضمون زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ آیت کی جو شان نزول احادیث صحیحہ میں بیان ہوئی، وہ بھی اسی کو مقتضی ہے کہ الفاظ کو ان کے عموم پر رکھا جائے۔ ''اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنا'' یا ''زمین میں فساد اور بدامنی پھیلانا'' یہ دو لفظ ایسے ہیں جن میں کفار کے حملے، ارتداد کا فتنہ، رہزنی، ڈکیتی، ناحق قتل ونہب، مجرمانہ سازشیں اور مغویانہ پروپیگنڈا سب داخل ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر جرم ایسا ہے جس کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں

سے جو آگے مذکور ہیں، کسی نہ کسی سزا کا ضرور مستحق ٹھہرتا ہے''(تفسیر عثمانی ۱۵۰)۔

مصنف کا رجحان بھی حرابہ اور فساد کے مصداق کی تعیین میں فقہا کی تعبیر کے بجائے اہل علم کے مذکورہ رجحان کے قریب تر ہے۔ایک دوسری بحث میں مصنف نے حرابہ کے مفہوم میں توسیعاً توہین رسالت کے جرم کو بھی شامل کرنے کے امکان کو تسلیم کیا ہے۔ مصنف کی رائے میں اگر توہین رسالت کا کوئی مجرم ''جب وہ توبہ اور رجوع سے انکار کر دے؛ سرکشی کے ساتھ توہین پر اصرار کرے؛ فساد انگیزی پر اتر آئے؛ دعوت، تبلیغ، تلقین ونصیحت اور بار بار کی تنبیہ کے باوجود باز نہ آئے، بلکہ مقابلے کے لیے کھڑا ہو جائے''تو جرم کی نوعیت کے لحاظ سے اسے آیت محاربہ میں مذکورہ مختلف سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

جلاوطن کرنا

''اِس سزا کے لیے 'اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، یعنی یہ کہ اُنھیں علاقہ بدر کر دیا جائے۔... قرآن کے الفاظ کا تقاضا ہے کہ عام حالات میں یہ سزا اِسی صورت میں دی جائے، لیکن کسی وجہ سے اگر یہ ممکن نہ ہو تو مجرم کو کسی خاص علاقے میں پابند یا اُس کے گھر میں نظر بند کر دینے سے بھی حکم کا منشا یقیناً پورا ہو جائے گا۔''(میزان، ۶۱۴)

یہ رائے مالکیہ اور احناف کے موقف سے ہم آہنگ ہے اور اس کی بنیاد اس نکتے پر ہے کہ مجرم کو ایک علاقے سے جلاوطن کرنے کی مصلحت اسے جرم سے باز رکھنا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مجرم کو جلاوطن کرنے میں بہتری کے بجائے فساد کا خدشہ ہو تو اسے جلاوطن نہ کیا جائے۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی کی رائے یہ نقل ہوئی ہے کہ انھوں نے مجرم کو جلاوطن کرنے کو 'فتنہ' سے تعبیر کیا (الشیبانی، کتاب الآثار، رقم ۶۱۴-۶۱۵)، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مجرم کی اصلاح کے بجائے مزید برائی میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہے۔ حنفی فقہا اسی کی روشنی میں 'نفی' کی صورت عموماً یہی بیان کرتے ہیں کہ مجرم کو قید کر دیا جائے، کیونکہ اس سزا کا مقصد مجرم کے شر وفساد سے لوگوں کو محفوظ بنانا ہے، جب کہ جلاوطن کرنے سے خدشہ ہے کہ مجرم کو جس علاقے کی طرف جلاوطن کیا جائے، وہ بھی اس کی شر انگیزی کا نشانہ بن جائیں گے (جصاص، احکام القرآن ۴/۵۹)۔ یہی رائے مالکی فقہا میں سے قاضی ابو بکر ابن العربی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجرم کو کسی دوسرے علاقے کی طرف جلاوطن کرنا الٹا اس کے لیے مزید جرائم کے ارتکاب میں معاون ہو سکتا ہے، اس لیے اسے قید کر دینا چاہیے، کیونکہ نقل وحرکت کی آزادی سے محروم کر دینا بھی ایک طرح سے جلاوطن کر دینے کے ہی ہم معنی

ہے (احکام القرآن ۲/۹۹)۔

جراحات کا کفارہ

”یہ کسی شخص کے غلطی سے قتل ہو جانے کا حکم ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ جراحات کا حکم بھی یہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُن میں بھی دیت ادا کی جائے گی اور اِس کے ساتھ کفارے کے روزے بھی دیت کی مقدار کے لحاظ سے لازماً رکھے جائیں گے۔ یعنی، مثال کے طور پر، اگر کسی زخم کی دیت ایک تہائی مقرر کی گئی ہے تو کفارے کے بیس روزے بھی لازماً رکھنا ہوں گے۔“ (میزان ۶۲۳)

قرآن مجید نے قتل خطا کی صورت میں، جب کہ مقتول مسلمان ہو، کفارے کے طور پر ایک غلام آزاد کرنے اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ مصنف نے اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ اخذ کیا ہے کہ قتل کے علاوہ جراحات کی صورت میں بھی دیت کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ کفارے کے طور پر روزے رکھنا لازم ہونا چاہیے۔ فقہی ذخیرے میں بہ ظاہر یہ ایک بالکل منفرد راے ہے۔

دیت کی مقدار

”خطا اور عمد، دونوں میں قرآن کا حکم یہی ہے کہ دیت معاشرے کے دستور اور رواج کے مطابق ادا کی جائے۔ قرآن نے خود دیت کی کسی خاص مقدار کا تعین کیا ہے نہ عورت اور مرد، غلام اور آزاد، مسلم اور غیر مسلم کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھیرائی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے فیصلے اپنے زمانے میں عرب کے دستور کے مطابق کیے۔ فقہ وحدیث کی کتابوں میں دیت کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں، وہ اِسی دستور کے مطابق ہیں۔... قرآن مجید کی ہدایت ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے ہے، چنانچہ اُس نے اِس معاملے میں معروف کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ قرآن کے اِس حکم کے مطابق ہر معاشرہ اپنے ہی معروف کا پابند ہے۔“ (میزان ۶۲۴)

مصنف نے یہاں جمہور اہل علم کے برخلاف مولانا امین احسن اصلاحی کی راے سے اتفاق کیا ہے۔ روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی مقدار سو اونٹ مقرر فرمائی۔ فقہی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقریر وتصویب کو شرعی حکم کی حیثیت دی گئی اور دیت کے باب میں سو اونٹوں ہی کو ایک ابدی معیار تسلیم کیا گیا ہے، تاہم مولانا اصلاحی کی راے یہ ہے کہ قرآن مجید نے ’فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‘

(البقرہ ۲: ۱۷۸) کے الفاظ سے اس معاملے کو 'معروف' پر مبنی قرار دیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ہدایت کی پیروی میں اپنے دور میں دیت کی وہی مقدار، یعنی سو اونٹ مقرر فرمائی جو اسلام سے پہلے اہل عرب میں رائج تھی۔ چونکہ معروف سے متعلق معاملات زمانہ اور حالات کے تغیر سے اپنے اصل مقصد کو باقی رکھتے ہوئے بدل جاتے ہیں، اس لیے دیت کی ادائیگی کی صورتیں اور اس کی مقدار وغیرہ طے کرنا ارباب اجتہاد کا کام ہے (تدبر قرآن ۲/ ۳۶۱)۔

مصنف نے اس استدلال سے اتفاق کیا ہے اور قرار دیا ہے کہ دیت کی مقدار کی تعیین کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی حیثیت ابدی تشریع کی نہیں، بلکہ ایک اصولی شرعی حکم کے وقتی اور زمان و مکان میں محدود اطلاق کی ہے۔ مصنف نے اس مسئلے کے مبنی بر عرف ہونے کی تائید میں 'فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ' کے علاوہ سورۂ نساء میں 'دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ' میں اختیار کردہ اسلوب کو بھی پیش کیا ہے۔*

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

* اس پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے ہماری کتاب: حدود و تعزیرات چند اہم مباحث۔

محمد ذکوان ندوی

محبت رسول: اہمیت اور تقاضے

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

سلام اُس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سکھلائے
سلام اُس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

سلام اُس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

سلام اُس پر کہ دشمن کو حیاتِ جاوداں دے دی
سلام اُس پر ابو سفیان کو جس نے اماں دے دی

سلام اُس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اُس پر ہوا مجروح جو بازارِ طائف میں

سلام اُس پر وطن کے لوگ جس کو تنگ کرتے تھے
سلام اُس پر کہ گھر والے بھی جس سے جنگ کرتے تھے

سلام اُس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی، نہ سونا تھا
سلام اُس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

سلام اُس پر جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھاتا تھا
سلام اُس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا

سلام اُس پر جو امت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اُس پر جو فرشِ خاک پر جاڑے میں سوتا تھا

سلام اُس پر جو دنیا کے لیے رحمت ہی رحمت ہے
سلام اُس پر کہ جس کی ذات فخرِ آدمیّت ہے

سلام اُس پر کہ جس نے جھولیاں بھر دیں فقیروں کی
سلام اُس پر کہ مشکیں کھول دیں جس نے اسیروں کی

سلام اُس پر کہ جس کا نام لے کر اُس کے شیدائی
الٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت، اوجِ دارائی

سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

سلام اُس ذات پر کہ جس کے یہ پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالد و حیدر کے افسانے

درود اُس پر کہ جس کا نام تسکینِ دل وجاں ہے
درود اُس پر کہ جس کے خُلق کی تفسیر قرآں ہے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

درود اُس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
درود اُس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی

درود اُس پر کہ جس کے تذکرے ہیں پاک بازوں میں
دروداُس پر کہ جس کا نام لیتے ہیں نمازوں میں

درود اُس پر، جسے شمعِ شبستانِ ازل کہیے
درود اُس پر، ابد کی بزم کا جس کو کنول کہیے

درود اُس پر، بہارِ گلشنِ عالم جسے کہیے
درود اُس ذات پر فخرِ بنی آدم جسے کہیے

رسولِ مجتبیٰ کہیے، محمد مصطفیٰ کہیے
وہ جس کو ہادیِ 'دَعْ مَا کَدِرْ، خُذْ مَا صَفَا' کہیے

ایمان بالرسالت اور محبت رسول کی تجدید

ماہر القادری (وفات: ۱۹۷۸ء) کا یہ کلام سادہ اسلوب میں گویا سیرت رسول کا ایک بہترین خلاصہ ہے۔ ضرورت ہے کہ آج ہر طرح کے تعصب، بے روح 'مذہبیت'، فنی اور رسمی قسم کے نظام تعلیم و تعلم اور ہر قسم کی متعصبانہ گروہ پرستی سے بلند ہو کر ہماری مجلسوں، اداروں اور مسجدوں میں درود وسلام کی یہ صدا پھر اُسی انداز میں گونج اٹھے، جس طرح وہ آج کے اِس ماحول سے پہلے ہر طرف گونجتی تھی۔ آج کے مادی اور الحادی ماحول میں ضرورت ہے کہ نوجوانان ملت کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچے تعلق کی دبی ہوئی چنگاری کو ایک بار پھر سے شعلہ زن کر دیا جائے کہ:

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اِسے دورِ زماں میٹ رہا ہے!

اِس کے لیے ضروری ہو گا کہ ذکر و دعا اور صلوٰۃ وسلام کے اعتبار سے، یوم جمعہ کی خصوصی اہمیت کی بنا پر (کنز العمال، رقم ۲۱۰۳۷) اِس دن خاص طور پر اپنے گھروں اور مسجدوں میں منعقد تذکیری اور تربیتی مجالس کے دوران میں سنجیدہ و باادب انداز میں حمد و نعت پر مبنی کلام اور کثرت صلوٰۃ وسلام کا اہتمام کیا جائے۔ اِس طرح عام طور پر لوگوں کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و اطاعت کے پاکیزہ اور فطری جذبات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ اِس قسم کے دعوتی اور تذکیری حلقے گویا ایمان بالرسالت کی تجدید کے ہم معنی ثابت ہوں گے۔

امید ہے کہ اِس سے دل کی ویران کھیتیاں سرسبز و شاداب ہوں گی اور اُن میں اللہ اور رسول کی محبت و حرارت پیدا ہو گی۔ یہ دین کا منشا اور ایمان کا اولین تقاضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اہل ایمان کا سچا تعلق قائم ہو۔ آپ کے ساتھ یہ زندہ تعلق دلوں میں ایمان کی روح پھونکنے کا بہترین ذریعہ، آپ کے

اسوۂ حسنہ، آپ کے لائے ہوئے دین سے وابستگی اور موجودہ مادی اور الحادی طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک تازہ دم فوج (سپاہ تازہ) کی حیثیت رکھتا ہے:

سپاہِ تازہ بر انگیزم ازولایت عشق کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است!

"عقل کی بے باکی اور سرکشی کی بنا پر حرم کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ لہٰذا اِس طوفان سے مقابلہ کرنے کے لیے ہم مملکت عشق سے جنوں کی ایک تازہ دم فوج لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔"

سچی محبت اور وقتی جذباتیت میں فرق

محبت رسول کے اِس پاکیزہ جذبے کا اُس پر شور "جذباتیت" سے کوئی تعلق نہیں جس کے بعض مظاہر ہمارے ہاں اکثر "حب رسول" کے نام پر خود آپ اور آپ کے لائے ہوئے دین و پیغام کی بدنامی کا سبب بنتے رہے ہیں۔ حب رسول ایک انتہائی سنجیدہ نوعیت کا معاملہ ہے۔

حب رسول وہی ہے جو اپنے ذہنی اور قومی مفروضات کے بجائے خود رسول کے بتائے ہوئے ارشادات کے مطابق ہو۔ اِس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن کی سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۲۴، اور سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۲۱ سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی پسند و ناپسند اور اُن کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا معیار بنائیں۔ وہ اُنھیں اپنے ماں باپ، مال و اولاد، تمام محبوب اشیا اور تمام محبوب افراد و شخصیات سے زیادہ محبوب سمجھیں۔ وہ اُنھیں ہر دوسری محبت اور اپنے تمام مادی، نفسانی اور دنیوی تقاضوں پر ترجیح دیں۔

محبت الٰہی اور محبت رسول

اللہ اور رسول کی محبت کے درمیان اِس طرح کی قانونی تقسیم درست نہیں کہ اللہ کی نسبت سے جو چیز مطلوب ہے، وہ محبت ہے، اور رسول کی نسبت سے جو چیز مطلوب ہے، وہ محض آپ کا اتباع ہے۔ محبت کے بغیر نہ اتباع ممکن ہے اور نہ دین میں ایسے میکانکی اتباع کی کوئی اہمیت ہے جس میں محبت کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ اپنی اصل کے اعتبار سے، اللہ اور رسول کی محبت گویا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہم آپ کو "محمد بن عبد اللہ" کے بجائے "محمد رسول اللہ" مانتے ہیں۔ اللہ رب العٰلمین سے آپ کا یہی مخصوص تعلق اِس بات کا متقاضی ہے کہ ہم آپ سے محبت کریں۔ اللہ سے محبت رب العٰلمین

سے محبت ہے اور رب العٰلمین سے محبت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ اُس کے فرستادہ و پیغمبر سے محبت کی جائے۔ رسول سے یہ محبت کسی مجرد بنیاد پر نہیں ہوتی، بلکہ اللہ ہی کے لیے اور اللہ ہی کی وجہ سے قائم ہوتی ہے۔ حب رسول، دراصل حب خداوندی ہی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

أَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوْكُمْ مِنْ نِعَمِه، وأَحِبُّوْنِي بِحُبِّ اللّٰه، وَأَحِبُّوا اَهْلَ بَيْتِي لِحُبِّي. (ترمذی، رقم ۳۷۸۹)

”اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اُن نعمتوں کی وجہ سے جو اُس نے تمھیں عطا فرمائی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو، اور میرے اہل بیت سے میری خاطر محبت کرو۔“

اِس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے حافظ ابن قیم (وفات: ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں:

وكلّ محبَّة وتعظيم للبشر، فإنّما تجوز تبعاً لمحبة اللّٰه وتعظيمه كمحبة رسوله وتعظيمه، فإنّها من تمام محبّة مرسله وتعظيمه، فإن أمته يحبونه لحبّ اللّٰه له ويعظّمونه ويجلّونه لإجلال اللّٰه له، فهي محبَّة للّٰه من مُوجبات محبّة اللّٰه وكذلك محبّة أهل العلم والإيمان ومحبة الصّحابة رضي اللّٰه عنهم وإجلالهم تابعٌ لمحبة اللّٰه ورسوله لهم. والمقصود أن النّبِي صلى اللّٰه عليه وسلم ألقى اللّٰه سبحانه وتعالٰى عليه منه المهابة والمحبة. ولكلّ مؤمن مخلص حظّ من ذلك. (جلاء الافہام فی فضل الصلاۃ والسلام ۱۸۷)

”انسان کی ہر محبت و تعظیم اللہ کی محبت و تعظیم کے تابع ہو گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تعظیم درحقیقت آپ کو مبعوث کرنے والے پروردگار سے محبت کی بنا پر ہے۔ لہٰذا امت کے افراد جو آپ سے محبت رکھتے، وہ اللہ ہی کی وجہ سے محبت رکھتے، اور آپ کی جو قدر و منزلت کرتے، وہ اللہ کی محبت اور اُس کی عظمت ہی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اہل علم و ایمان اور صحابہ سے محبت کا سبب بھی یہی ہے۔ یہ سب اللہ اور رسول کی محبت کے تابع ہے۔ غرض، اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عظمت و محبت کا ایک بڑا حصہ عنایت کیا ہے۔ نیز ہر سچے اور مخلص مومن کو بھی اِس میں سے ایک حصہ عطا فرمایا گیا ہے۔“

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اطاعت رسول کی اہمیت

اِس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے استاذ جاوید احمد غامدی تحریر فرماتے ہیں:

”نبی کو نبی مان لینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنی کتاب میں خود واضح فرما دی ہے کہ نبی صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں، بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ وہ اِس لیے نہیں آتا کہ لوگ اُس کو نبی اور رسول مان کر فارغ ہو جائیں۔ اُس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح کی نہیں، بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ اُس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جو ہدایت وہ دے، اُس کی بے چون وچرا تعمیل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ. (النساء ۴: ۶۴)

”اِنھیں بتاؤ کہ ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اِسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اُس کی اطاعت کی جائے۔“

اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہدایت نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے دیتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اصلی مقصود تو خدا کی اطاعت ہے، مگر اِس کا طریقہ یہی ہے کہ اُس کے نبیوں کی اطاعت کی جائے۔...

لہٰذا یہ اطاعت کوئی رسمی چیز نہیں ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ یہ اتباع کے جذبے سے اور پورے اخلاص، پوری محبت اور انتہائی عقیدت و احترام سے ہونی چاہیے۔ انسان کو خدا کی محبت اِسی اطاعت اور اِسی اتباع سے حاصل ہوتی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (آل عمران ۳: ۳۱)

”اِن سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا، اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔“ (میزان ۱۴۸-۱۴۹)

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بار بار 'اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ' (النساء ۴: ۵۹۔ النور ۲۴: ۵۴) کہہ کر اللہ اور رسول کی اطاعت کا ایک ساتھ حکم فرمایا اور رسول کی اطاعت کو خود اللہ کی اطاعت (النساء ۴: ۸۰) قرار دیا ہے۔ اِسی طرح آپ نے واضح طور پر فرمایا ہے:

مَن أطاعني فقد أطاع الله، ومَن　　”جس نے میری اطاعت کی، اُس نے اللہ کی

عصاني فقد عصى الله. (بخاری، رقم ۷۱۳۷)

اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اُس نے براہِ راست اللہ رب العٰلمین کی نافرمانی کا ارتکاب کیا۔"

چنانچہ خود اللہ کے پیغمبر کی زبان سے اہلِ ایمان کو اِس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ اگر وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں تو اُنھیں اِس محبت الٰہی کے حصول اور اِس دعوے کے ثبوت کے لیے دین کی پیروی اور رسول کے اتباع کا طریقہ لازماً اختیار کرنا ہوگا (آل عمران ۳: ۳۱)۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

لا يؤمن أحدُكم حتى يكون هواه تَبَعاً لِما جئتُ به. (الاربعین ۴۱)[1]

"تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک کامل الایمان نہیں ہو سکتا، جب تک اُس کی خواہشات میرے لائے ہوئے دین کے تابع فرمان نہ ہو جائیں۔"

ایمان اور محبت رسول کے مابین تعلق پر مبنی چند پیغمبرانہ ارشادات و واقعات ملاحظہ فرمائیں:

☆ عَنْ أنسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهِ وَوَالِدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ". (مسلم، رقم ۴۴)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اُس کے نزدیک اُس کی اولاد، اُس کے والد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

☆ عَنْ أَبِي هريرة و عن أ نَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "والذي نفسي بيده، لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهِ وَوَالِدِهِ [ومِنْ أهلِه وَمالِه] وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ". (بخاری، رقم ۱۴-۱۵۔ فتح الباری ۱/ ۸۲)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ

۱۔ امام نووی (وفات: ۶۷۶ھ) نے اِس روایت کو نصر بن ابراہیم مقدسی (وفات: ۴۹۰ھ) کے حوالے سے نقل کرتے ہوئے اِسے حسن صحیح قرار دیا ہے: 'وقال النووي: حديث حسن صحيح، رويناه في كتاب "الحُجّة على تارك المحبّة"۔ نصر بن إبراهيم المقدسي- بإسناد صحيح' (فتح الباری ۱۳/ ۲۸۹)۔

اُس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ میں اُس کے نزدیک اُس کے والدین، اُس کے آل واولاد، اُس کے مال و منال، غرض تمام محبوب چیزوں اور تمام محبوب افراد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔‘‘

☆عَنْ أنسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ’’لا يجد أحدٌ حلاوةَ الإيمان، حتىّ يُحِبَّ المرءُ لا يحبُّه إلا لله، وحتىّ أن يُقذَفَ في النارِ أحبُّ إليه مِنْ أن يَرجِعَ إلى الكفرِ بَعدَ إذ أنقذه اللّٰهُ، وحتىّ يكونَ اللّٰهُ ورسولُه أحبُّ إليه ممّا سِواهما‘‘. (بخاری، رقم ۶ ۱۴۰۔ مسلم، رقم ۱۶۵)

’’کوئی شخص اُس وقت تک ایمان کی حلاوت نہیں پا سکتا، جب تک وہ کسی شخص سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے؛ اور ایمان کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پھر جانے سے، آگ میں ڈال دیا جانا اُس کو محبوب ہو، مگر کفر میں جانا اُس کو پسند نہ ہو؛ اور جب تک دوسری تمام چیزوں کے مقابلے میں، اللہ اور رسول اُس کو زیادہ محبوب نہ ہو جائیں۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

☆عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ هِشَامٍ رضي الله عنه قَالَ: كُنّا مَعَ النبيّ صلى الله عليه وسلم، وَهوَ آخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، فَقَالَ له عُمَرُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، لأنتَ أحبُّ إليَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إلاَّ مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النبيّ صلى الله عليه وسلم: ’’لَا، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِه، حَتّٰى أكُوْنَ أحبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِك‘‘. فَقَالَ لَهُ عُمَرُ: فإنّه الآنَ، وَ اللّٰهِ، لَأنتَ أحبُّ إليّ مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النّبِي صلى الله عليه وسلم: ’’الآنَ يَا عُمَر!‘‘. (بخاری، رقم ۶۲۵۲)

’’عبد اللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ روایت بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ، آپ مجھے اپنی جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ اِس پر آپ نے فرمایا: نہیں، قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے (تم اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے)، یہاں تک کہ میں تمھیں اپنی جان سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ انھوں نے عرض کیا: اے خدا کے رسول، اللہ کی قسم، اب مجھے آپ اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: اے عمر، اب تمھاری محبت کامل ہوئی ہے۔‘‘

☆ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسی محبت رکھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا:

كان و الله، أحبَّ إِلَيْنا مِن أموالنا، وأولادِنا، وآبائنا، وأمّهاتِنا، ومِن الماءِ الباردِعلى الظَّمأُ.

(المناہل، السیوطی ۷۔۹۵۷۔الشفا، القاضی عیاض ۴۹۷)

”خدا کی قسم، آپ ہمارے مال واولاداور ہمارے ماں باپ سے زیادہ ہمیں محبوب،اور حالت پیاس میں ٹھنڈے پانی سے زیادہ مرغوب تھے۔“

ذکر الٰہی اور ذکر رسول

یہاں ذکر رسول سے ہماری مراد تذکیر و دعوت کے دوران میں رسول اور اصحابِ رسول کی سیرت واخلاق، آپ کے اسوۂ حسنہ کا بیان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے حلقے ہیں۔ اپنی اصل کے اعتبار سے، ذکر رسول اور ذکر الٰہی، دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ذکر الٰہی اگر اِس لیے مطلوب ہے کہ اللہ ہمارا خالق و مالک اور منعم و کارساز ہے تو اتباع رسول کے جذبے سے آپ کی سیرت واخلاق کا ذکر و بیان اللہ سے آپ کے اِسی مخصوص تعلق کی بنا پر مطلوب ہوگا۔ یہ صرف اللہ کا رسول ہے جو ہمارے اور اللہ کے درمیان وسیلۂ ایمان و معرفت ہے۔ اب آپ کی پیروی اور آپ ہی کی سیرت کے ذریعے سے ایک شخص ایمان باللہ اور اُس کی حقیقی معرفت و محبت حاصل کر سکتا ہے۔

محبت رسول یا اتباع رسول

اِس معاملے میں اتباع اور محبت کا سوال بھی محض ایک کلامی نوعیت کی چیز ہے۔ اللہ اور رسول کی محبت جب اپنی اصل مطلوب صورت میں پیدا ہو جائے تو پھر اِس کے بعد اِس قسم کا تکنیکی سوال درست نہیں کہ رسول کی نسبت سے جو چیز مطلوب ہے، وہ اُس کی محبت ہے یا صرف اتباع؟ اللہ کے رسول سے سچی محبت اور تعلق کے بعد اُس کی محبت اور اتباع میں فرق کرنا بے معنی ہوگا۔

محبت گہرے قلبی تعلق (emotional attachment) کا نام ہے، اور اِس طرح کے سچے قلبی تعلق کے بعد کسی انسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے محبوب کی نافرمانی کرے اور اُس کی پیروی کے معاملے میں سنجیدہ نہ ہو۔ چنانچہ مشہور قول ہے: ’کُلّما ازْداد الحبُّ، زادتِ الطاعات‘ (محبت میں جس قدر اضافہ ہوگا، اطاعت میں اُسی قدر اضافہ ہوتا جائے گا)۔ امام شافعی (وفات: ۲۰۴ھ) نے اپنے ایک شعر میں اِس

حقیقت پر بہت خوب روشنی ڈالی ہے:

لوكان حبُّك صادقًا، لأطعتَه

إنّ المُحبَّ لِمَنْ يُحبُّ مُطيعُ

”اگراللہ اور رسول سے تمھاری محبت سچی ہو تو تم اُن کی اطاعت ضرور کروگے۔اِس لیے کہ ایک محبت کرنے والا شخص اپنے محبوب کا فرماں بردار ہوا کرتا ہے۔“

چنانچہ تیسری صدی کے ایک مشہور عالم ابو سلیمان دارانی (وفات: ۲۱۵ھ) نے فرمایا کہ لوگوں نے جب محبت کا دعویٰ کیا تو اُن کے اِس دعوے کو جانچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے 'آیت محبت' (آل عمران ۳: ۳۱) کو ایک معیار کے طور پر نازل فرمادیا ('لمّا ادّعت القلوبُ محبّةَ الله تعالىٰ، أنزل اللهُ لها مِحْنَةً' مدارج السالکین، ابن القیم ۳/ ۲۲)۔

www.almawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

'آیت محبت' کا مفہوم

اِس معاملے میں سورۂ آل عمران کی آیت 'قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ' (۳: ۳۱) کے حوالے سے یہ کہنا درست نہیں کہ رسول کی صرف پیروی مطلوب ہے، محبت مطلوب نہیں۔اِس آیت میں محبت کی تعریف (definition) یا اُس کے تمام حدود بیان نہیں کیے گئے ہیں، بلکہ یہاں محبت کا اصل تقاضا بیان کیا گیا ہے۔آیت میں انسان کی نسبت سے مطلوب فطری جذبات محبت کی نفی ہرگز نہیں۔ایسا سمجھنا انسان اور محبت، دونوں کی تصغیر کے ہم معنی ہوگا۔

اِسی طرح آیۂ زیر بحث کا یہ مطلب بھی نہیں کہ رسول کی یہ اتباع، محبت سے خالی اور جذبات سے عاری ہو۔ آیت میں جس بات کی تاکید کی گئی ہے، وہ بے روح قسم کی کوئی جامد تقلید یا ظاہر دارانہ دین داری نہیں، بلکہ اتباع رسول کا حقیقی ثبوت دے کر رسول سے اپنے دعواے محبت کی تصدیق کرنا ہے۔اصل یہ ہے کہ جو اطاعت طوعاً ہو، وہی مطلوب ہے، کرہاً کی جانے والی اطاعت، جس میں قلبی تعلق شامل نہ ہو، وہ اطاعت نہیں، بلکہ صرف بے روح 'مذہبیت' ہے جو خدا کے یہاں مقبول نہیں۔

خدا کے دین میں ایسا ایمان باللہ اور ایمان بالرسول جس میں قلبی تعلق کارفرما نہ ہو، اکثر حالات میں محض ظاہر داری کے ہم معنی ہوا کرتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا حقیقی تعلق اُس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا، جب تک اِس کی بنیاد دو چیزوں پر نہ ہو —— ایمان، اور اطاعت۔اور اطاعت وہی ہے جو طوعاً ہو،

نہ کہ کرہاً، یعنی قلبی تصدیق اور دل کی پوری رضا مندی کے ساتھ، جس میں جبر و اِکراہ شامل نہ ہو۔ اِس روح سے خالی تصور اطاعت صرف ایک ایسا مبتدعانہ تصور ہوگا جو کتاب و سنت میں سر تا سر اجنبی ہے (ملاحظہ فرمائیں: تزکیۂ نفس، امین احسن اصلاحی)۔

احیاے سنت اور اتباع رسول: تقاضاے محبت

قرآن میں اِس بات کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ اہل ایمان دعوت و اقامت دین کی راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو بن کر نہ صرف پوری طرح آپ کا ساتھ دیں، بلکہ اللہ کے پیغمبر کی حیثیت سے وہ آپ کی بھرپور تعظیم و توقیر کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا. لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُعَزِّرُوۡهُ وَتُوَقِّرُوۡهُ ؕ وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا. (الفتح ۴۸: ۸-۹)

”اے پیغمبر، ہم نے تم کو گواہی دینے والے، خوش خبری پہنچانے والے اور آگاہ و خبردار کرنے والے کی حیثیت سے مبعوث کیا ہے تاکہ (اے لوگو)، تم اللہ کے رسول پر سچا ایمان لاؤ اور رسول (کے مشن میں اُس) کا ساتھ دو، اُس کی بھرپور تعظیم اور توقیر کرو، اور اِس طرح تم صبح و شام اللہ کی خوب تسبیح بیان کرتے رہو۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا یہ ایک لازمی تقاضا ہے کہ آدمی آپ کی سیرت و اخلاق، آپ کی لائی ہوئی دعوت کے ابلاغ اور احیاے سنت کے لیے بھرپور کوشش کرتے ہوئے آپ کی زندگی کو اپنی زندگی اور آپ کی ایمانی اور اخلاقی دعوت کو اپنا مشن بنائے (’حبُّ النبي صلى الله عليه وسلم يُوجِبُ السعيَ إلى إحياءِ سنّته، والحِفاظَ علٰى دعوته‘)۔ چنانچہ آپ نے اپنے ایک ساتھی انس بن مالک کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

مَن أحيا سنّتي فقد أحبّني، ومَن أحبّني، كان معي في الجنة.
(ترمذی، رقم ۲۶۰۲)

”جس نے میری سنت اور میری تعلیمات کو زندہ کیا، اُس نے مجھ سے محبت کی اور جو مجھ سے محبت کرے گا، وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔“

حافظ ابن قیم (وفات: ۷۵۱ھ) علم دین کی دعوت و اشاعت کے متعلق فرماتے ہیں:

...ولولم يكن في تبليغ العلم عنه إلاحصولُ ما يحبُّه صلى اللّٰهُ عليه وسلم، لكفٰى به فضلاً. ومعلومٌ أنه لا شيء أحبُّ إلٰى رسولِ اللّٰه صلى اللّٰهُ عليه وسلم من إيصاله الهدىٰ إلى جميع الأمة، فالمبلّغ عنه مسارعٌ في حصولِ محبته، فهو أقربُ الناسِ منه وأحبّهم إليه، وهو نائبه وخليفته في أمته، وكفىٰ به فضلاً وشرفًا للعلم وأهله.(مفتاح دار السعادة ۲۷۹)

”اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملے ہوئے علم کی اشاعت سے آپ کے پسندیدہ عمل پر کاربند ہونے کے سوااور کوئی مقصد نہ ہوتا، جب بھی یہ اُس کی اہمیت کے لیے کافی تھا۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اِس سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ تھی کہ اللہ کی ہدایت تمام امت دعوت و اجابت تک پہنچ جائے۔ لہٰذا پیغمبرانہ علم کو پہنچانے والا آدمی عملاً اُس کی محبت کے حصول میں کوشاں ہے۔ چنانچہ ایسا شخص سب سے زیادہ قریب اور محبوب تر ہوگا۔ وہ گویا امت میں آپ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ لہٰذا یہی ایک بات علم نبوت اوراُس کے حامل افراد کے فضل و شرف کے لیے کافی ہے۔“

صحابہ وتابعین کی زندگی میں جذباتی تعلق کی مثالیں

انسان عقلی اور جذباتی وجود (emotional being)، دونوں کا مجموعہ ہے۔ یہ جذبہ اگر اپنے فطری دائرے میں ہو تو وہ نہ صرف ایک مطلوب چیز ہے، بلکہ وہ انسان کے لیے اُس کے خالق کی طرف سے استثنائی قسم کے ایک عظیم عطیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کا یہی جذباتی وجود ہے جس سے وہ رحمی اور خاندانی رشتے وجود میں آتے ہیں جن کے بغیر دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جذبات کا یہی وہ قیمتی بندھن ہے جس نے انسان کو حیوان سے بالکل ممتاز کر دیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر ادب و آرٹ اور رنگ و جمال کا ایک فردوس حسن و معنی یہاں آباد دکھائی دیتا ہے۔ صحابہ وتابعین کے واقعات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اطاعت کے ساتھ آپ سے قلبی اور جذباتی تعلق ایمان بالرسول کے بالکل ایک فطری

اور بدیہی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس سلسلے میں چند ارشادات و واقعات یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

☆ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

جاءَ رجلٌ إلى النبيّ صلَّى اللّٰهُ عليْهِ وسلَّمَ فقالَ: يا رسولَ اللّٰهِ، إنَّكَ لأحَبُّ إليَّ من نَفسي وإنَّكَ لأحبُّ إليَّ من ولدي. وإنِّي لأكونُ في البيتِ فأذْكرُكَ، فما أصبِرُ حتَّى آتي فأنظُرَ إليْكَ. وإذا ذَكرتُ موتي وموتَكَ عرفتُ أنَّكَ إذا دخلتَ الجنَّةَ، رفعتَ معَ النَّبيِّينَ وأنِّي إذا دَخلتُ الجنَّةَ، خَشيتُ أن لا أراكَ. فلم يردَّ عليْهِ النَّبيُّ صلَّى اللّٰهُ عليْهِ وسلَّمَ شيئًا، حتَّى نزلَ جبريلُ بِهذِهِ الآية: ’’وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ‘‘ الخ.

(المعجم الکبیر، الطبرانی، رقم ۱۲۵۵۹)

’’اصحاب رسول میں سے ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول، آپ مجھے میری جان اور میرے اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہیں۔ جب میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں اور آپ مجھے یاد آتے ہیں تو مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ چنانچہ میں آپ کے پاس آتا اور آپ کا دیدار کر لیتا ہوں۔ لیکن جب مجھے اپنی موت اور آپ کی وفات کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ وہاں جنت میں آپ انبیا کے ساتھ ہوں گے۔ اور اگر میں جنت میں داخل ہوا تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہاں میں آپ کا دیدار نہ کر سکوں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص کو کوئی جواب نہیں دیا، حتیٰ کہ جبریل یہ آیت لے کر نازل ہوئے: ’وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا‘ (النساء ۴: ۶۹)۔‘‘

☆ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

أنَّ رَجُلًا سَأَلَ النبي صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلَّمَ عَنِ السَّاعَةِ، فَقَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ قَالَ: ’’وَمَاذَا أعْدَدْتَ

’’ایک صاحب (ذوالخویصرہ یمانی یا ابوموسیٰ اشعری) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے بارے میں پوچھا کہ قیامت کب قائم

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لَهَا". قَالَ: لا شيءَ، إِلَّا أَنِّي أُحِبُّ اللّٰهَ ورَسولَه صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلَّمَ. فَقَالَ: "أَنْتَ مع مَن أَحْبَبْتَ". قَالَ أَنَسٌ: فَما فَرِحْنَا بشيءٍ، فَرَحَنا بقَوْلِ النبيِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلَّمَ: "أَنْتَ مع مَن أَحْبَبْتَ". قَالَ أَنَسٌ: فأَنَا أُحِبُّ النبي صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلَّمَ وأَبا بَكْرٍ، وعُمَرَ، وأَرْجُو أَنْ أَكُونَ معهُمْ بحُبِّي إِيَّاهُمْ، وإِنْ لَمْ أَعْمَلْ بمِثْلِ أَعْمَالِهِمْ. (بخاری، رقم ۳۶۸۸)

ہو گی؟ آپ نے فرمایا کہ تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ انھوں نے عرض کیا: کچھ بھی نہیں، سوااِس کے کہ میں اللہ اور اُس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تمھارا حشر بھی اُنھی کے ساتھ ہو گا جن سے تمھیں محبت ہے۔ سیدنا انس کہتے ہیں کہ ہمیں کبھی اتنی خوشی کسی اور بات سے بھی نہیں ہوئی، جتنی آپ کا یہ ارشاد سن کر ہوئی کہ تمھارا حشر انھی کے ساتھ ہو گا جن سے تمھیں محبت ہے۔ سیدنا انس فرماتے ہیں کہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتا ہوں اور اُن سے اپنی اِس محبت کی وجہ سے امید رکھتا ہوں کہ میرا حشر بھی اُنھی کے ساتھ ہو گا، اگرچہ میں اُن جیسے عمل نہ کر سکا۔"

ایک دوسری روایت میں ارشاد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس سوال پر کہ تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ سائل نے عرض کیا: میرے پاس اِس کے لیے بہت ساری نمازیں اور روزے اور بہت زیادہ صدقہ وخیرات تو نہیں ہے، البتہ میں اللہ اور اُس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ اِس پر آپ نے فرمایا: تم اُس کے ساتھ ہو جس سے تم محبت رکھتے ہو: 'قالَ: ما أَعْدَدْتَ لَهَا قالَ: ما أَعْدَدْتُ لَهَا مِن كَثِيرِ صَلَاةٍ ولَا صَوْمٍ ولَا صَدَقَةٍ، ولَكِنِّي أُحِبُّ اللّٰهَ ورَسولَهُ، قالَ: أَنْتَ مع مَن أَحْبَبْتَ' (بخاری، رقم ۶۱۷۱۔ مسلم، رقم ۲۶۳۹)۔

☆ غزوۂ احد (۳ھ) کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ بنو دینار کی ایک خاتون (سُمَیراء بنت قیس) کے اہل خانہ میں سے تین افراد (باپ، بھائی اور شوہر) اِس غزوے میں شہید ہو گئے۔ اُس کو جب یہ خبر دی گئی تو انھوں نے پوچھا: 'فما فعل رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم؟' (یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کیسے ہیں)؟۔اُنھیں بتایا گیاکہ آپ بخیر وعافیت ہیں۔ چنانچہ وہ آپ کے پاس پہنچیں اور آپ کو دیکھ کر عرض کیا: ’كُلُّ مصيبةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ، يارسولَ الله‘، ”آپ کے بعد ہر مصیبت ہیچ ہے، اے اللہ کے رسول“ (السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام ۳/ ۵۱)۔

☆عن ابْنِ سِيْرِين قال: قلتُ لِعُبَيْدَة: عندَنَا مِنْ شَعْرِ النبيّ صلى الله عليه وسلم، أَصَبْنَاهُ مِنْ قِبَلِ أنسٍ، أومِنْ قِبَلِ أَهْلِ أنسٍ، فَقَالَ: لأَن تَكُوْنَ عِندِي شَعْرَةٌ مِنه أَحَبُّ إلَيَّ مِنَ الدنيَا وَمَا فِيْهَا. (بخاری، رقم ۱۶۸۔ احمد، رقم ۱۳۷۱۰)

”محمد بن سیرین تابعی (وفات: ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ جب میں نے (مشہور تابعی) عبیدہ بن عمرو سلمانی (وفات: ۷۲ھ) کو بتایا کہ ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ موے مبارک موجود ہیں، جنھیں ہم نے سیدنا انس، یا اُن کے گھر والوں سے حاصل کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: اگر ان میں سے ایک بال بھی میرے پاس ہوتا تو وہ مجھے دنیا کی ساری نعمتوں سے کہیں زیادہ محبوب ہوتا۔“

امام ذہبی (وفات: ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں کہ سیدنا عبیدہ کا یہ قول کمال محبت کا ایک عجیب نمونہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک موے مبارک کو ساری دنیا میں موجود سونے چاندی کے خزانوں پر ترجیح دی جائے (’هذا القولُ مِن عبيدة هو معيارُ كمالِ الحُبِّ، وهوأن يُؤثر شعرة نبوية علٰى كلِّ ذهبٍ وفضَّةٍ بأيدي النّاس‘۔ سیر اعلام النبلاء ۴/ ۴۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی محبت اور آپ سے یہی جذباتی تعلق ہے جسے بعد کے اہل ایمان کی نسبت سے خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: ”مِنْ أشدِّ أمتي لي حُبًّا، ناسٌ يكونون بعدي، يود أحدُهم لو رآني بأهله وماله“.
(مسلم، رقم ۲۸۳۲)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں مجھ سے شدید محبت والے وہ لوگ ہیں جو میرے بعد ہوں گے۔ اُن میں سے ایک شخص کی بہترین آرزو یہ ہو گی کہ کاش، وہ اپنا تمام مال و دولت اور اپنے اہل و عیال سب کو قربان کر کے میرا دیدار کر سکے۔“

صحابہ و تابعین کے مذکورہ واقعات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے واضح طور پر معلوم ہوتا

ہے کہ مومن کوئی بے روح مشینی مخلوق نہیں کہ وہ جامد انداز میں ایک عمل کو دہراتا رہے۔ مومن ایک زندہ انسان ہوتا ہے، اور ایک ایسا انسان کبھی محبت و جذبات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یہ تابعین اور اصحاب، بلاشبہ اتباع رسول کے راستے پر گام زن تھے، مگر اِسی کے ساتھ وہ آپ کی محبت میں سرشار، آپ کی سلامتی کے لیے بے چین، نیز آپ اور آپ سے منسوب ہر چیز کے لیے سراپا اشتیاق رہا کرتے تھے۔

خلاصۂ کلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمان بالرسول کا وہ بدیہی تقاضا ہے جو آپ کی نسبت سے ایک سچے مومن کے اندر فطری طور پر موجزن ہوا کرتا ہے۔ میڈیا سنامی کے اِس دور میں، جب کہ عام طور پر 'بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ' (الحج ۲۲: ۸) کے مصداق، بہت سے 'مذہبی' اور غیر 'مذہبی' فلسفہ و افکار کی اشاعت دن رات جاری اور اُن کے بانی علما و مفکرین سے ایسی والہانہ محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا جا رہا ہے جو صرف اللہ اور رسول کا حصہ ہے (البقرہ ۲: ۱۶۵)۔

اِس صورت حال میں ضرورت ہے کہ ہر قسم کی گروہ بندی اور مسلک پرستی سے بلند ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی تعلق قائم ہو اور ہر جگہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیمات کا اِس کثرت کے ساتھ تذکرہ کیا جائے کہ وہی وقت کا غالب موضوع بن کر تمام فلسفہ ہاے حیات پر چھا جائے۔

ایمان و محبت کی اِس عظیم دعوتی اور ربانی مہم کو عمومی بنانے کے لیے ضروری ہو گا کہ ہر جگہ تذکیر بالقرآن، سیرت نبوی اور اُسوۂ صحابہ کے سنجیدہ دعوتی اور تربیتی حلقے قائم کیے جائیں۔ آپ کی سنت اور آپ کی سیرت سے بڑھ کر کوئی 'فکر و فلسفہ' اور آئیڈیالوجی (ideology) نہیں جو انسانیت کے لیے حیات بخش ثابت ہو۔ شخصی 'آئیڈیالوجی' اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اکثر 'خیال پرستی' ہوا کرتی ہے، وہ وحی الٰہی پر مبنی کوئی نظریۂ حیات نہیں۔ لہٰذا خدا کی کتاب اور اُس کے پیغمبر سے بڑھ کر دوسری اور کوئی چیز نہیں جو ہمارے لیے محبت و اتباع کا مرکز اور ربانی ہدایت کا مستند خدائی ماخذ بن سکے۔

[لکھنؤ، ۹/ اگست ۲۰۲۲ء، یوم عاشوراء، ۱۴۴۴ھ]

ڈاکٹر عرفان شہزاد

والدینیت* کے زعم میں والدین کی کوتاہیاں

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بچوں کی تربیت سے پہلے والدین کی تربیت ضروری ہے۔ والدین، والدینیت کے زعم میں بعض اوقات اولاد کے معاملے میں اپنی کوتاہیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

بچہ پیدا کرنے کا فیصلہ والدین کا ہوتا ہے، اس کی درخواست پر وہ اسے دنیا میں نہیں لاتے، اس لیے بچے کو دنیا میں لانا ان پر کوئی احسان نہیں ہے۔

ہمارے ہاں بالعموم والدین کا اپنے بچوں سے گفتگو اور مکالمے کا رواج نہیں ہوتا۔ بچہ کیا سوچتا ہے، اکثر والدین اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ بچہ اگر اپنے اندر اٹھنے والے سوالات، اپنے عجیب و غریب خیالات، اپنے خوف و خدشات، مشاہدات و تاثرات کے غلط اور درست نتائج کا ذکر اپنے والدین سے نہیں کرتا تو یہ والدین کی ناکامی ہے۔ اور اگر وہ اس بارے میں کچھ بات کرنے کی کوشش کرے اور اس کو سنجیدہ لینے کے بجائے اس کی بچگانہ سوچوں کا مذاق اڑایا جائے یا نظر انداز کر دیا جائے تو یہ والدین کی مجرمانہ غفلت ہے، جس کے برے اور بہت برے نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔

---

* یہ اصطلاح مستعمل نہیں ہے۔ مصنف نے اسے Parenthood کے مترادف کے طور پر تشکیل دیا ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ مفید ترجمانی ہے۔ مدیر

بلوغت کے قریب بچہ اپنے اندر جسمانی، ذہنی اور مزاجی تبدیلیوں میں اگر والدین کی رہنمائی اور ان کے تحمل سے محروم رہتا ہے تو یہ والدین کی ناکامی ہے۔ بچوں سے جذبات کی رو میں بہ کر کوئی غلطی ہو جائے، وہ ضمیر کی خلش کا شکار ہو جائیں، اور وہ اس گھٹن سے نجات پانے کے لیے آپ کو مطلع بھی نہ کر سکیں، انھیں اعتماد نہ ہو کہ ان کی غلطی پر ڈانٹ ڈپٹ کے بعد، بلکہ مار پیٹ کے بعد بھی، ان سے قطع تعلق نہیں کر لیا جائے گا، ہمیشہ کے لیے انھیں نظروں سے گرا نہیں دیا جائے گا تو یہ والدین کی ناکامی ہے۔

بچے کا والدین سے دل کی بات کرنے کا راستہ اگر استوار رہے تو وہ کبھی خود کشی نہیں کرے گا، نشے کا شکار نہیں ہو گا، ہسٹریا کے دورے نہیں پڑیں گے، اسے کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

کچھ والدین کا یہ وتیرہ ہوتا ہے کہ بچے کو کوئی بات سمجھانا ہو تو اس کے دوستوں یا رشتہ داروں کے توسط سے بات اپنی اولاد کو پہنچاتے ہیں۔ وہ دراصل یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو خود سمجھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یوں بچہ دوسروں کی نظر میں بھی چھوٹا پڑ جاتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہمارے ہاں والدین اور بچوں کے درمیان بالعموم بات چیت چند مخصوص ہدایات، احکامات اور فرمایشوں تک محدود رہتی ہے۔ سارا دن میں بچوں کے ساتھ بات چیت کا جائزہ لیجیے۔ یہ کھانا کھانے، کپڑے پہننے، دانت برش کرنے، نہانے، ہوم ورک کرنے، وقت پر سونے وغیرہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان کو والدینیت کی معراج سمجھا جاتا ہے، مگر بچوں کو وقت دینا اس میں شامل نہیں، جس سے ذاتی اور جذباتی تعلق استوار ہوتا ہے۔ بچے اسکول سے آتے ہیں تو ٹیوشن پڑھنے چلے جاتے ہیں، وہاں سے لوٹتے ہیں تو قاری صاحب سے ناظرہ پڑھنے کا وقت ہو جاتا ہے، ان سے چھوٹتے ہیں تو ٹی وی یا انٹرنیٹ پر کچھ دیر کوئی پروگرام، گیم یا چیٹنگ میں وقت گزارتے ہیں اور ادھر سونے کا وقت آ جاتا ہے۔ بچوں کو ایسا مصروف کر دیا گیا ہے کہ ان کے پاس والدین کے لیے وقت نہیں رہتا اور والدین بھی یہی چاہتے ہیں۔

یہی بچے والدین سے بات چیت کی روایت اور عادت نہ ہونے کے ساتھ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے بھی والدین کا وجود ایک ضرورت یا بچپن کی ایک یادگار سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتا۔ والدین سے جذباتی وابستگی تو ہوتی ہے، مگر ذہنی قرب اس درجے کا نہیں ہوتا جو آخری عمر میں والدین کو ان سے درکار ہوتا ہے۔ عمر کے آخری دور میں جب ماں کچن اور باپ ملازمت سے فارغ ہو جاتے ہیں، دوست، یار، رشتہ دار یا تو دنیا سے

رخصت ہو چکے ہوتے ہیں یا میسر نہیں ہوتے تو اس وقت وہ اپنے دل کی باتیں کرنے کے لیے اپنے بچوں کی طرف پلٹتے ہیں، لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان گفتگو کی بنیاد ہی موجود نہیں ہوتی اور مکالماتی خلا (communication gap) کی گہری خلیج کو پاٹنے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

ماں باپ کو دل کی باتیں بتانے کے لیے ترسنے والا چھوٹا سا بچہ، جو کبھی خود سے باتیں کر کے دل ہلکا کر لیتا تھا، یا دو بول بولنے کے لیے کسی ہم عمر، ہم جماعت کو تلاش کرتا تھا، اب بڑا ہو چکا ہوتا ہے۔ بات چیت کے لیے اس نے دوسرے محرم تلاش کر لیے ہوتے ہیں۔ اب والدین سے اس کا تعلق بھی چند ہدایات تک محدود ہو جاتا ہے: ''آپ نے کھانا کھا لیا؟''، ''دوا وقت پر لے لی؟''، ''مارکیٹ جا رہا ہوں، آپ کو کچھ منگوانا ہو تو بتائیے''۔ دل سے دل تک کا راستہ ماہ و سال کی ریت میں پٹ چکا ہوتا ہے، اس کی بازیافت اب ممکن نہیں رہتی۔

یہ اولاد والدین کی تکلیف پر رو سکتے ہیں، ان کے علاج پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں، ان کے لیے لڑ مر بھی سکتے ہیں، لیکن بے بسی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ چاہ کر بھی وہ ان کے پاس دل جمعی سے دو گھڑی بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے۔ ان کے الفاظ، محاورے، گفتگو کے مقدمات اور اسالیب، اذواق اور دل چسپی کے موضوعات، سب والدین سے مختلف اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔

بہت سہولت سے اولاد کو مورد الزام ٹھیرا دیا جاتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی عمر میں والدین سے بات نہیں کرتے۔ پھر وہ کہانی سنائی جاتی ہے کہ ایک بوڑھا ایک کوّے کو دیکھ کر بیٹے سے پوچھتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ بیٹا جواب دیتا ہے کہ کوّا ہے، باپ چند بار مزید پوچھتا ہے۔ بیٹا تنگ آ جاتا ہے۔ اس پر باپ اپنی ڈائری لے کر آتا ہے کہ تم نے اپنے بچپن میں بیس مرتبہ کوّے کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے ہر بار لطف لیتے ہوئے تمھیں بتایا تھا کہ وہ کوّا ہے۔

اس کہانی میں لڑکے کے بچپن سے جوانی کی طرف یک دم چھلانگ لگا دی گئی ہے، اور بیچ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ لڑکا جب کچھ بڑا ہوا تھا تو باپ نے اس کے ساتھ پیار تو کیا تھا، کھانا کپڑا اور دیگر ضرورتیں اور خواہشیں بھی پوری کی تھیں، لیکن اس کے ساتھ باتیں کرنا اور اس کی باتیں سننا چھوڑ دیا تھا۔ باپ سے کچھ کہنے کے لیے اسے ماں یا بہن بھائیوں میں سے باپ کے کسی فیورٹ سے کہلوانا پڑتا تھا۔ پھر یہ ہوا تھا کہ والدین سے گفتگو کی ضرورت ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں یا بہن بھائیوں میں سے کسی کو اپنا محرم راز بنا لیا تھا، چنانچہ اس کے دوست اور اس کے بہن بھائی جن سے اس کا گفتگو کا تعلق ہوتا ہے، وہ جب ان سے ملتا ہے تو گھنٹوں باتیں

کرتا ہے۔ اسے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ یہی وہ والدین کے ساتھ بھی کر سکتا تھا، اگر گفتگو کا تعلق توڑ نہ لیا گیا ہوتا۔

ہمارے ہاں ایک خام خیالی یہ بھی ہے کہ بیٹے بیٹیوں کے مقابلے میں کم محبت کرتے ہیں۔ اس کلیے میں کوئی صداقت نہیں۔ بیٹے اور بیٹی کے رویوں میں محبت کے اظہار میں جو فرق نظر آتا ہے، وہ در حقیقت والدین کے رویے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ والدین بیٹوں کے مقابلے میں بیٹیوں سے زیادہ پیار جتاتے ہیں اور خود ہی باور کر لیتے ہیں کہ بیٹوں سے پیار جتانے کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی، پھر یہ کہ بیٹوں پر رعب قائم رکھنے کے لیے بھی ان سے پیار کم جتایا جاتا ہے۔

محبت کے اظہار کے رویے بھی بچے اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں۔ پیار کا اظہار جس طرح ان کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ بے ساختہ وہی طریقہ اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بیٹے بھی والدین، خاص طور پر والد سے اپنی محبت کے اظہار میں ایسے ہی کم آمیز ہوتے ہیں، جیسے وہ ان کے ساتھ پیار کے اظہار میں کم آمیز ہوتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں فخر سے بتایا جاتا ہے کہ ہم نے آج تک والد کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ والد صاحب کے گھر آتے ہی پورے گھر پر سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔ والد صاحب اپنی اس آمرانہ حاکمیت کا لطف لیتے لیتے جب ریٹائرڈ ہو کر چارپائی سے لگ جاتے ہیں تو ان کی خدمت کرنے والے تو بہت ہو سکتے ہیں، لیکن ان سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ دل کی بات آپ کسی سے نہ کر سکیں، اس سے بڑھ کر کیا اذیت ہو سکتی ہے!

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بچوں کا والدین سے دوری اختیار کرنے میں قصور سراسر نہیں تو اکثر والدین کا ہوتا ہے۔ آج اپنے بچوں کے دل، زبان اور کان سے رابطہ قائم کیجیے، کل وہ بھی آپ کی باتیں سن سکیں گے، ورنہ ناصر کاظمی کا یہ شعر زیر لب پڑھتے ہوئے وقت گزاریے:

منہ لپیٹے پڑے رہو ناصرؔ
ہجر کی رات ڈھل ہی جائے گی

خورشید احمد ندیم

سوال کیسے اٹھایا جائے؟

تطہیر علم کے لیے یہ سوال کلیدی ہے۔ میں نے استاذ گرامی جاوید احمد صاحب غامدی سے جو کچھ سیکھا، اس میں اہم ترین سبق یہی ہے۔ معلومات کی اہمیت اپنی جگہ، مگر یہ ایک بے معنی عمل ہے، اگر تطہیر علم نہ ہو۔ دونوں میں فرق وہی ہے جو کتابوں کے ڈھیر اور فلسفی کے دماغ میں ہے۔ منتشر اور بے ترتیب کتابوں کے انبار سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آپ اس ڈھیر کے ساتھ جتنا وقت گزاریں، حاصل پراگندگی فکر کے سوا کچھ نہیں۔ فلسفی یا دانش ور کا دماغ، معلومات کو ترتیب دیتا اور ان میں ایک ربط پیدا کرتے ہوئے، انھیں ایک قابل فہم مقدمے میں بدل دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ مقدمہ درست نہ ہو، لیکن فلسفی کی یہ خدمت کم اہم نہیں ہوتی کہ وہ حصول علم کے عمل کو صحیح راستے پر ڈال دیتا ہے۔

لوگوں کے پاس معلومات ہوتی ہیں، لیکن فلسفی یا دانش ور کا دماغ نہیں ہوتا۔ یوں وہ ان معلومات کی بنیاد پر کچھ ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جو 'عالمانہ' نہیں ہوتے۔ اس سے خلط مبحث پیدا ہوتا ہے اور معاملات سنبھلنے کے بجاے مزید الجھ جاتے ہیں۔ اگر ان پر یہ واضح ہو کہ معاملے کو کس زاویے سے اٹھانا ہے تو ان کے بہت سے فکری تضادات از خود دور ہو جائیں۔

اس بات کی طرف سب سے پہلے میرا دھیان اُس وقت ہوا جب میں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب ''تزکیۂ نفس'' پڑھی۔ اس کی معنویت جاوید صاحب کی صحبت سے پوری طرح واضح ہوئی۔ مولانا نے یہ مقدمہ قائم کیا ہے کہ تزکیۂ نفس کے لیے تزکیۂ علم لازم ہے۔ اگر علم کا تزکیہ نہ ہو تو تزکیۂ نفس کی کوشش ایسے افکار اور اعمال سے آلودہ ہو سکتی ہے جس کا انجام گم راہی ہے۔

یہ بات تدریجاً واضح ہوتی گئی جب تصوف پر مزید پڑھنے کا موقع ملا۔ مسلم سماج میں جہاں تصوف کی ایک

روایت ہے، وہاں نقد تصوف کی ایک روایت بھی ہے، جسے 'اسلامی تصوف' کہا گیا۔ علامہ اقبال جیسے صوفی اور مفکر نے بھی یہ لکھا کہ 'عجمی تصوف' اسلام کی سرزمین پر ایک اجنبی پودا ہے۔ اسی سوچ کے تحت تصوف کی تطہیر کی ایک کوشش شروع ہوئی تاکہ اسے عجمی تصورات سے پاک کیا جائے۔ یہ کاوش بے نتیجہ رہی۔ اہل علم نے بتایا کہ تزکیۂ تصوف کے نام پر جو کچھ ہوا، وہ محض الفاظ کا الٹ پھیر ہے۔ مثال کے طور پر شیخ احمد سرہندی کے بارے میں یہ خیال کیا گیا کہ انھوں نے وحدت الشہود کا تصور دے کر 'اسلامی تصوف' کو وحدت الوجود کے ان اثرات سے محفوظ کر دیا جو عجمی تصور ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بعد میں آ کر یہ بتایا کہ یہ محض لفظی نزاع ہے۔ ان دونوں میں کوئی جوہری فرق نہیں۔

یہ کوشش لاحاصل کیوں ہوئی؟ اس کی وجہ وہی ہے کہ مسئلے کو صحیح بنیاد پر نہیں سمجھا گیا۔ سوال ایک غلط جگہ سے اٹھایا گیا، جس کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ اہل علم نے اس سوال کو مخاطب بنایا کہ اسلامی تصوف کو عجمی تصوف کے اثرات سے کیسے محفوظ بنایا جائے؟ اس سوال میں یہ غلطی مضمر تھی کہ تصوف ایک درست فلسفۂ حیات ہے۔ ہمارا کام اسے قرآن و سنت کے مطابق ثابت کرنا ہے۔ یوں تصوف سے ہمارا فکری و مذہبی تشخص مجروح نہیں ہو گا۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ تصوف، اسلام کے برعکس ایک فلسفۂ حیات ہے، جو پہلے سے موجود تھا۔ جب دونوں کا ماخذ ایک نہیں تو ان میں تطبیق کیسے ہو سکتی تھی؟

تصوف کی روایت اسلام سے قدیم تر ہے۔ یہ دو چیزوں کا مجموعہ ہے: ایک فلسفۂ حیات اور ایک طریقۂ حیات۔ بطور طریقہ یا منہج یہ دنیا سے بے رغبتی کا مظہر ہے۔ یہ انسان کو ان ترغیبات سے اٹھ جانے کا درس دیتا ہے جو فرد کی شخصیت اور سماج میں فساد کا باعث بنتے ہیں۔ مسلم سماج میں جب دنیاداری کے اثرات بڑھنے لگے تو کچھ نیک لوگوں نے یہ خیال کیا کہ صوفیانہ روایت کو مسلم معاشرے میں بھی رواج دیا جائے تاکہ لوگ دنیا کی محبت سے نکلیں جو حرص و لالچ کو فروغ دیتی اور انسان کو خود غرض بناتی ہے۔

اس تصور کو مسلمان سماج میں مقبول بنانے کے لیے یہ کہا گیا کہ تصوف بھی وہی کچھ ہے جسے اسلام 'تزکیۂ نفس' کہتا ہے۔ اس طرح تصوف کا ایک ایسا تصور متعارف کرانے کی کوشش ہوئی جو ایک مسلمان کے لیے اجنبی نہ ہو۔ بات، مگر یہاں تک محدود نہیں رہی، تصوف کو طریقۂ حیات کے ساتھ فلسفۂ حیات کے طور پر بھی قبول کر لیا گیا۔ اب اس فلسفے کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت پیش آئی۔ مثال کے طور پر وحدت الوجود تصوف کی اساس ہے۔ اب مسلم صوفیا نے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ قرآن مجید بھی اسی کو پیش کرتا ہے۔ یہ

سلسلہ دراز ہوتا گیا، یہاں تک کہ مسلم سماج میں تصوف کی پوری روایت شامل ہو گئی، جو قدیم سے تھی۔ اس موقع پر کچھ اہل علم کو خیال ہوا کہ قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کی تائید نہیں کرتے جو تصوف کے ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔ جیسے وحدت الوجود۔ یوں اس پر تنقید شروع ہوئی اور اصلاح تصوف کی تحریک اٹھی۔ امام ابن تیمیہ اس کی نمایندہ شخصیت ہیں۔ شیخ احمد سرہندی بھی اسی طبقے میں شامل ہیں۔

اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اس مسئلے کو صحیح جگہ سے اٹھایا جاتا۔ صحیح جگہ یہ تھی کہ تزکیۂ نفس کے باب میں سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا کہ قرآن مجید کیا کہتا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں کیا رہنمائی فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے تزکیے کو پیغمبر کی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو بات پیغمبر بھیجنے کی وجہ ہے، اسلام اسی کے بارے میں کوئی رہنمائی نہ دے اور ہمیں اس مقصد کے لیے کسی دوسری روایت کی طرف رجوع کرنا پڑے؟ اگر پیغمبر اس لیے تشریف لائے کہ وہ انسانوں کا تزکیہ کریں تو لازم ہے کہ ان کے لائے ہوئے دین میں اس کے حصول کا مکمل ضابطہ موجود ہو۔

اس کے لیے ضروری تھا کہ تزکیۂ نفس کے افکار اور اعمال کو قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ میں تلاش کیا جائے۔ اگر ہم یہاں سے تزکیۂ نفس کا سفر شروع کریں گے تو اس کا کوئی امکان نہیں کہ کوئی عجمی یا غیر اسلامی تصور مسلم سماج میں در آئے۔ اس کے بعد ہمیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اسلامی تصوف کے کسی خود ساختہ تصوف کو عجمی تصورات سے پاک کرنے کی سعی لاحاصل میں توانائیاں برباد کرتے رہیں۔ یہی وہ بات ہے جسے مولانا امین احسن اصلاحی 'تزکیۂ علم' کہتے ہیں۔ جب علم کا تزکیہ ہو جاتا ہے اور وہ قرآن و سنت کی بنیادوں پر استوار ہو جاتا ہے تو پھر تزکیۂ نفس کا سفر اس سمت میں شروع ہو جاتا ہے جس میں منزل یقینی ہے۔

میں آج کل جب لوگوں کو مذہبی اور سیاسی مباحث میں الجھتا دیکھتا ہوں تو اکثر خیال آتا ہے کہ یہ لوگ کس لاحاصل مشق میں مصروف ہیں؟ سوشل میڈیا تو گویا پراگندگی فکر کا شاہ کار ہے۔ جاوید احمد صاحب غامدی کی ایک بڑی علمی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے سماج کو تطہیر علم کی راہ دکھائی۔ انھوں نے معاشرے کو سکھایا کہ سوال کیسے اٹھایا جاتا ہے۔ میں نے جب سے اس پہلو سے سوچنا شروع کیا ہے، مجھ پر یہ خوش گوار انکشاف ہوا کہ میں اکثر، اپنی کم علمی کے باوجود، ان نتائج تک پہنچ جاتا ہوں جن پر بحر علوم میں برسوں شناوری کرنے والے پہلے سے پہنچے ہوتے ہیں۔

(بشکریہ: روزنامہ دنیا، لاہور، ۲۰/ اپریل ۲۰۲۳ء)

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۲۰)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ

قبیلہ اور کنبہ

حضرت سلمہ بن ہشام نے مکہ میں قریش کی شاخ بنو مخزوم میں جنم لیا۔ مغیرہ بن عبد اللہ دادا اور عمر بن مخزوم سکڑ دادا تھے۔ تمام حالات نویسوں نے ان کی والدہ کا نام حضرت ضباعہ بنت عامر لکھا ہے، جب کہ ابن حبان نے ضبابہ بتایا (کتاب الثقات ۳/ ۱۶۴)۔ ابو ہاشم حضرت سلمہ کی کنیت تھی۔

ابو جہل بن ہشام، عاص بن ہشام، حضرت حارث بن ہشام اور خالد بن ہشام ان کے سوتیلے بھائی، حضرت خالد بن ولید اور حضرت ولید بن ولید چچا زاد تھے۔ ابو جہل اور عاص نے جنگ بدر میں مشرکین مکہ کی فوج میں شامل ہو کر قتال کیا اور جہنم واصل ہوئے، خالد غزوۂ فرقان میں مسلمانوں کی قید میں آیا، فدیہ دے کر چھوٹا اور حالت کفر میں مرا۔ حضرت سلمہ اور حضرت حارث نے اسلام قبول کیا اور مخلص اہل ایمان میں شمار ہوئے۔

حضرت ضباعہ بنت عامر عرب کی انتہائی حسین عورتوں میں سے تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں بکر بن وائل کے شاعر اور خطیب ہوذہ بن حنفی کے عقد میں تھیں۔ اس کے بعد بنو تیم کے سردار عبد اللہ بن جدعان سے نکاح

کیا، کوئی اولاد نہ ہوئی تو طلاق لے کر ہشام بن مغیرہ سے بیاہ کیا۔ ان سے حضرت سلمہ کی ولادت ہوئی۔ حضرت ضباعہ نے ۱۰ھ میں وفات پائی۔

قبول اسلام

مکہ میں اسلام کی روشنی پھیلی تو حضرت سلمہ بن ہشام اس سے مستفید ہونے والے پہلے اصحاب میں شامل تھے۔ ان کی والدہ بھی مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

ہجرت حبشہ

حضرت ولید بن ولید نے اسلام قبول کیا تو بنو مخزوم کے کچھ لوگ ان کے بھائی ہشام بن ولید کے پاس گئے اور کہا: ہمارے قبیلے کے سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابو ربیعہ اور ولید بن ولید اپنے دین سے پھر گئے ہیں۔ ہم انھیں گرفتار کر کے سزا دینا چاہتے ہیں تاکہ دوسرے نوجوانوں کی سرکشی سے مامون ہو جائیں۔ ہشام نے کہا: اگر تم نے میرے بھائی کو قتل کیا تو میں تمھارے سردار کو جان سے مار ڈالوں گا۔ تب وہ ہشام کو برا بھلا کہتے ہوئے واپس چلے آئے۔

ان حالات میں کہ جب کئی کم زور مسلمان مشرکین کی ایذاؤں کا شکار تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حبشہ ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت سلمہ بن ہشام حضرت جعفر بن ابو طالب کے قافلۂ ہجرت میں شامل ہوئے۔ بنو مخزوم کے حضرت شماس بن عثمان، حضرت ہبار بن سفیان، حضرت عبد اللہ بن سفیان، حضرت ہشام بن ابو حذیفہ اور حضرت عیاش بن ابو ربیعہ حبشہ کی اس ہجرت ثانیہ میں ان کے ہم سفر تھے۔

حبشہ سے مراجعت

شوال ۵ر نبوی میں قریش کے قبول اسلام کی غلط خبر حبشہ میں موجود اصحاب تک پہنچی تو کچھ نے یہ کہہ کر مکہ کا رخ کیا کہ ہمارے کنبے ہی ہمیں زیادہ محبوب ہیں۔ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ جو خبر انھیں سنائی گئی، جھوٹ تھی تو ان میں سے اکثر حبشہ لوٹ گئے۔ ابن ہشام نے مکہ میں داخل ہونے والے اصحاب کی گنتی تینتیس بتائی ہے، حالاں کہ انھی کی مرتبہ فہرست کا شمار اڑتیس بنتا ہے۔ بنو مخزوم کے حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد نے اپنے ماموں ابو طالب بن عبد المطلب کی پناہ لی، حضرت شماس کفار کی دست برد سے محفوظ رہے، جب کہ حضرت سلمہ بن ہشام کو ان کے بھائی ابو جہل نے قید کر لیا، مارا پیٹا اور بھوکا پیاسا رکھا۔

مکہ کے محبوسین کے لیے دعاے قنوت

مکہ میں حضرت سلمہ بن ہشام، حضرت ولید بن ولید، حضرت عیاش بن ابو ربیعہ اور دیگر مستضعفین اپنے

رشتہ داروں کے ظلم و ستم اور قید و بند کا شکار تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں فجر اور عشا کی نمازوں میں ان کے لیے خصوصی دعاے قنوت فرماتے۔

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی آخری رکعت میں، رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے 'سمع الله لمن حمده' کہتے، پھر حالت قیام میں کچھ اصحاب کا نام لے کر دعا فرماتے: 'اللّٰهُمَّ انج الوليد بن الوليد وسلمة بن هشام وعياش بن أبي ربيعة والمستضعفين من المومنين، اللّٰهُمَّ اشدد وطأتك على مضر، اللّٰهُمَّ اجعلها عليهم سنين كسني يوسف'، ''اے اللہ، ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابو ربیعہ اور کم زور اہل ایمان کو مشرکوں سے رہائی دے۔ اے اللہ، مضر کے کافروں کو خوب پیس ڈال۔ یا اللہ، یوسف کے قحط کے سالوں کی طرح ان کے ایام و سال سخت کر دے'' (بخاری، رقم ۸۰۴۔ مسلم، رقم ۱۴۸۵۔ نسائی، رقم ۱۰۷۵۔ ابن ماجہ، رقم ۱۲۴۴۔ احمد، رقم ۷۴۶۵)۔

آپ نے ۱۵/ رمضان سے آخر رمضان تک (ایک ماہ، مسلم، رقم ۱۴۸۷۔ ابوداؤد، رقم ۱۴۴۲) مسلسل یہ دعا مانگی اور عید کی صبح چھوڑ دی (مسلم، رقم ۱۴۸۵۔ نسائی، رقم ۱۰۷۴۔ ابن ماجہ، رقم ۱۲۴۴۔ احمد، رقم ۷۲۶۰، ۷۶۶۹۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۹۶۹)۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۴۰۲۸ میں نماز فجر، احمد، رقم ۹۲۸۵ میں نماز ظہر اور بخاری، رقم ۴۵۹۸، ۶۳۹۳۔ ابوداؤد، رقم ۱۴۴۲۔ احمد، رقم ۱۰۰۷۲۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۹۸۶ میں نماز عشا کے آخر میں یہ دعا مانگنے کا ذکر ہے۔ شعیب الارنؤوط نے 'نماز ظہر کے بعد' والے حصے کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق آپ نے ہر نماز کے بعد یہ دعا مانگی۔ آپ وقتاً فوقتاً یہ دعا مانگتے رہے، تا آنکہ حضرت ولید بن ولید، حضرت سلمہ بن ہشام اور حضرت عیاش بن ابو ربیعہ کفار کی قید سے چھوٹ گئے۔ حضرت ابوہریرہ بتاتے ہیں: ایک روز آپ نے یہ دعا نہ مانگی۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ وہ آ چکے ہیں (ابوداؤد، رقم ۱۴۴۲۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۹۸۶)۔

رہائی کے بعد مدینہ کا سفر

حضرت سلمہ کے بھائی ابوجہل اور عاص بن ہشام غزوۂ بدر میں جہنم رسید ہوئے، اس کے باوجود انھیں اپنے بھائیوں کی قید سے رہائی نہ مل سکی۔ جنگ خندق کے بعد حضرت ولید بن ولید بچ کر مدینہ آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت عیاش بن ابو ربیعہ اور حضرت سلمہ بن ہشام سخت تنگی میں ہیں۔ ان دونوں کے پاؤں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چھڑا کر واپس لانے کی ذمہ داری حضرت ولید ہی کو سونپ دی۔ حضرت ولید مکہ پہنچے اور ان اصحاب کے کھانے پر مامور باندی کا پیچھا کرتے ان کے قید خانے تک

جا پہنچے، دیوار پھلانگ کر ان کی رسیاں کاٹیں اور اونٹ پر سوار کر کے مدینہ کا رخ کیا۔ قریش کو ان کے نکلنے کی خبر ہوئی تو خالد بن ولید کچھ لوگوں کے ساتھ ان کے پیچھے نکلے۔ یہ اصحاب سمندر کے کنارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق ہجرت پر گام زن تھے۔ خالد بن ولید عسفان تک آئے اور انھیں نہ پا سکے۔

حضرت سلمہ کا اونٹ کھینچتے ہوئے حضرت ولید کے پاؤں کی انگلی زخمی ہو گئی تو انھوں نے یہ شعر پڑھا:

هل أنت إلا إصبع دميت

وفي سبيل الله ما لقيت

''تیری حقیقت ایک زخمی انگلی کے سوا کیا ہے اور مجھے جو تکلیف ملی ہے، اللہ کے راستے میں ملی ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلمہ اور حضرت عیاش کے آنے کی خبر پہلے ہو گئی۔

ماں کا اظہار مسرت

بیٹا قید سے چھوٹ گیا تو حضرت سلمہ کی والدہ حضرت ضباعہ نے یہ اشعار کہے:

لا هم رب الكعبة المحرمة

اظهر على كل عدو سلمه

''اے اللہ، محترم کعبہ کے رب، سلمہ کو ہر دشمن پر غالب کر دے۔''

له يدان في الأمور المبهمه

إحداهما تردى و أخرى منعمه

''مشکل غیر یقینی معاملات میں دو ہاتھ رکھتا ہے، ایک ہاتھ ہلاک کرتا ہے اور دوسرا سخاوت کرنے والا ہے۔''

حضرت ضباعہ کو پیغام نکاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ضباعہ بنت عامر سے نکاح کا پیغام ان کے بیٹے حضرت سلمہ بن ہشام کو دیا تو انھوں نے کہا: میں ان سے مشورہ کر لوں۔ وہ اپنی والدہ کے پاس آئے تو انھوں نے پوچھا: تم نے کیا جواب دیا؟ حضرت سلمہ نے بتایا کہ میں نے آپ سے مشورہ کرنے کا کہا۔ حضرت ضباعہ نے کہا: کیا نبی کے رشتے میں بھی مشورہ کیا جاتا ہے؟ میں چاہتی ہوں کہ میرا حشر آپ کی ازواج میں ہو جائے۔ جاؤ اور نکاح کر دو۔ حضرت سلمہ لوٹ کر آئے اور والدہ کی رضامندی کا بتایا، لیکن آپ خاموش رہے، آپ کو بتایا گیا تھا کہ حضرت ضباعہ سن رسیدہ ہیں۔ یہ نکاح نہ ہو سکا۔

جنگ موتہ

مدینہ ہجرت کرنے کے بعد حضرت سلمہ بن ہشام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ ۹ھ میں آپ نے انھیں موتہ جانے والے لشکر میں شامل ہونے کا حکم دیا۔ آپ کے فرمان کے مطابق تین اصحاب حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابو طالب اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ باری باری اسلامی فوج کی کمان کرتے ہوئے شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر فوج کی قیادت سنبھالی اور ایک دن کی مختصر جنگ کرنے کے بعد فوج کو بہ حفاظت مدینہ واپس لے آئے۔

مدینہ آمد کے بعد حضرت سلمہ بن ہشام گھر میں مقید ہو گئے۔ ان کی اہلیہ ام المومنین حضرت ام سلمہ سے ملنے گئیں تو انھوں نے پوچھا: کیا بات ہے، سلمہ مسجد میں نظر نہیں آتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک نہیں ہوتے، کیا ان کو کوئی عارضہ لاحق ہے؟ ان کی اہلیہ نے بتایا کہ لوگ انھیں اور جنگ موتہ کے دوسرے غازیوں کو بھگوڑا ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ حضرت ام سلمہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: وہ فرار ہونے والے نہیں، ان شاء اللہ دوبارہ حملہ کریں گے۔ وہ مسجد میں آیا کریں، تب حضرت سلمہ گھر سے نکلنے لگے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شہادت فی سبیل اللہ

مشہور روایت کے مطابق حضرت سلمہ بن ہشام جمادی الاولیٰ ۱۳ھ کو حضرت ابو بکر کی وفات سے چوبیس دن پہلے جنگ اجنادین میں داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے، جب کہ طبری اور ابن کثیر نے حضرت سلمہ بن ہشام کا شمار جنگ یرموک کے شہدا میں کیا ہے۔ دونوں مؤرخین نے جنگ اجنادین کے شہیدوں میں بھی ان کا نام شامل کیا ہے۔ ان دونوں معرکوں کے شہیدوں میں بڑا التباس پایا جاتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ذہبی نے اجنادین اور یرموک کے شہدا کا بیان ایک فصل میں یکجا کر دیا ہے (سیر اعلام النبلاء ۱/ ۳۱۴)۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق حضرت سلمہ بن ہشام کی شہادت ۱۴ھ (۶۳۵ء) میں، عہد فاروقی کی ابتدا میں مرج الصفر کے معرکہ میں ہوئی۔ ابن جوزی نے اسی روایت کو اختیار کیا۔ ''فتوح البلدان'' میں بلاذری نے جنگ اجنادین اور ''انساب الاشراف'' میں مرج الصفر کو ترجیح دی۔

روایت حدیث

حضرت سلمہ بن ہشام سے کوئی روایت مروی نہیں۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، انساب الاشراف (بلاذری)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

حضرت ہشام بن ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ

نسب

حضرت ہشام بن ابوحذیفہ کے والد کا اصل نام مہشم تھا، اپنی کنیت ابوحذیفہ سے جانے جاتے تھے۔ مغیرہ بن عبداللہ ان کے دادا اور بانی قبیلہ مخزوم بن یقظہ پانچویں جد تھے۔ بنو مخزوم کی حضرت ام حذیفہ بنت اسد ان کی والدہ تھیں۔ ابن سعد اور بلاذری نے ان کا نام ہاشم بن ابوحذیفہ بتایا ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں: محمد بن اسحٰق کی غلطی ہے کہ انھوں نے نام ہشام بن ابوحذیفہ لکھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نعمت ایمان کا ملنا

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو حضرت ہشام جلد ایمان لے آئے۔

اہل قبیلہ کا ردعمل

شہر میں اسلام کا ظہور ہوا تو بنو مخزوم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن بن گئے۔ انھوں نے کم زور مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ بنو ہاشم کا بائیکاٹ کرنے اور انھیں شعب ابوطالب میں شہر بدر کرانے میں ابوجہل مخزومی نے اہم کردار ادا کیا۔

بنو مخزوم سے تعلق رکھنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد ایمان بھی لائی۔ اس قبیلہ کے اصحاب رسول میں حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد، ام المومنین حضرت ام سلمہ، حضرت عیاش بن ابوربیعہ، حضرت شماس بن عثمان، حضرت عبداللہ بن سفیان، حضرت ہبار بن سفیان، حضرت ہشام بن ولید، حضرت سلمہ بن ہشام اور حضرت عبداللہ بن ابوربیعہ شامل ہیں۔ اس فہرست میں حضرت خالد بن ولید اور حضرت عکرمہ بن ابوجہل کا اضافہ بعد میں ہوا۔

سرزمین امن کی طرف ہجرت

مکہ کے نادار مسلمانوں پر کفار کا ظلم و ستم بڑھتا گیا تو حضرت ہشام بن ابوحذیفہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

ہدایت پر سوے حبشہ روانہ ہوئے۔ وہ حضرت جعفر بن ابوطالب کی قیادت میں حبشہ کی ہجرت ثانیہ میں شامل ہوئے۔ابن جوزی نے مہاجرین حبشہ کی فہرست میں حضرت ہشام بن ابوحذیفہ کا نام شامل نہیں کیا۔

حبشہ سے واپسی

ابن اثیر کہتے ہیں کہ حضرت ہشام ۷ھ میں حضرت جعفر بن ابوطالب کی قیادت میں مدینہ پہنچے، جب کہ ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ وہ جنگ بدر کے بعد کسی وقت مدینہ پہنچے اور انھوں نے شاہ نجاشی کی عطیہ کی ہوئی کشتیوں میں سفر نہ کیا۔بلاذری کا کہنا ہے کہ وہ حضرت جعفر بن ابوطالب کی واپسی سے پہلے مدینہ چلے آئے۔

حضرت ہشام اور غزوات

حبشہ سے واپسی کے بعد وفات تک حضرت ہشام بن ابوحذیفہ کا مدینہ میں قیام مختصر رہا۔غزوات میں ان کی شرکت کے بارے میں ہمیں کوئی رہنمائی نہیں ملی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس کے قول کے مطابق غزوۂ بدر میں ستر مشرک اہل ایمان سے قتال کرتے ہوئے جہنم واصل ہوئے۔ بنو مخزوم کے آٹھ کٹر کافران میں شامل تھے۔ابن اسحٰق نے اپنی سیرت میں ان میں سے چند کے نام گنوائے۔ابن ہشام نے ان کی سیرت کو بنیاد بنا کر ''السیرۃ النبویۃ'' ترتیب دی تو پچاس کافروں کے نام مکمل کیے، پھر یہ کہہ کر جنگ بدر کے ان مقتولین کا ابن اسحٰق نے ذکر نہیں کیا،اٹھارہ مشرکین کے اسما کا اضافہ کیا۔ان اسما میں بنو مخزوم کے ہشام بن حذیفہ بن مغیرہ کا نام بھی شامل کیا اور بتایا کہ اسے حضرت صہیب بن سنان نے قتل کیا۔ابن ہشام کا یہ بیان محل نظر ہے، کیونکہ ہشام بن ابوحذیفہ بن مغیرہ نام کے ایک ہی شخص ہیں جو اوائل اسلام میں ایمان لائے، اپنے چچازاد ابوجہل کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کی اور جنگ بدر کے کہیں بعد مدینہ لوٹے۔

بنو مخزوم کے خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل نے جنگ احد میں مسلمانوں کو زبردست جانی نقصان پہنچایا۔

وفات

بلاذری کا کہنا ہے کہ حضرت ہشام بن ابوحذیفہ نے جنگ تبوک کے زمانہ میں مدینہ میں وفات پائی۔

اولاد

حضرت ہشام بن ابوحذیفہ کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ صحابہ کے سیرت نگار جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب کی کوئی اولاد نہ تھی تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی سرے سے کوئی اولاد نہ ہوئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

حالات زندگی تحریر کرنے کے وقت ان کی اولاد میں سے کوئی زندہ فرد موجود نہیں۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، انساب الاشراف (بلاذری)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

حضرت خالد بن حزام رضی اللہ عنہ

نسب نامہ

خویلد بن اسد حضرت خالد بن حزام کے دادا تھے، ام حکیم بنت زہیر ان کی والدہ تھیں۔ اپنی کنیت سے مشہور ام حکیم کا نام زینب، صفیہ یا فاختہ (ابن سعد) بتایا جاتا ہے۔ ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد حضرت خالد کی پھوپھی تھیں۔ اسد بن عبدالعزیٰ جن سے قریش کی یہ شاخ منسوب ہے اور جن کی نسبت سے حضرت خالد اسدی کہلاتے ہیں، ان کے اور ان کی والدہ ام حکیم کے پردادا تھے۔ قصی بن کلاب پر حضرت خالد بن حزام کا سلسلۂ نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرہ سے جا ملتا ہے۔ قصی آپ کے اور حضرت خالد بن حزام کے پانچویں جد تھے۔ حضرت حکیم بن حزام اور ہشام بن حزام ان کے بھائی تھے۔ تاریخ ابن جوزی میں حضرت خالد بن حزام کے والد کا نام حرام لکھا ہے، یقیناً یہ کتابت کی غلطی ہے۔

قبول اسلام

اگرچہ حضرت خالد بن حزام کو السابقون الاولون میں شمار نہیں کیا گیا، تاہم وہ ام المومنین حضرت خدیجہ کے بھتیجے ہونے کی وجہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے جلد آگاہ ہو گئے اور فوراً اسلام قبول کر لیا۔ حضرت خالد کے چچا حضرت حکیم بن حزام اور چچا زاد حضرت خالد بن حکیم، حضرت ہشام بن حکیم، حضرت عبداللہ بن حکیم اور حضرت یحییٰ بن حکیم فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے۔

ہجرت حبشہ اور وفات

مشرکین مکہ کی ایذاؤں کا سلسلہ بعثت نبوی کے چوتھے سال کے وسط میں شروع ہوا۔ دن بہ دن بڑھتے بڑھتے

پانچویں سال کے وسط تک یہ اپنے عروج کو پہنچ گیا اور مسلمانوں کے لیے مکہ میں رہنا دشوار ہو گیا۔ تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہتر ہو اگر تم حبشہ کی سرزمین چلے جاؤ، جہاں ایسا بادشاہ حکمران ہے جس کی بادشاہی میں ظلم نہیں۔ چنانچہ رجب ۵/ نبوی میں گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل پہلا قافلہ سوے حبشہ روانہ ہوا۔ پھر حضرت جعفر بن ابوطالب کی قیادت میں اسّی افراد نے حبشہ کو ہجرت کی۔ حضرت خالد بن حزام ہجرت ثانیہ کے اسی قافلے کا حصہ تھے۔

حضرت خالد بن حزام سفر ہجرت پر تھے کہ ایک سانپ نے ان کو ڈس لیا اور وہ راستے ہی میں وفات پا گئے۔ یہ فرمان الٰہی ان کی وفات پر منطبق ہوتا ہے: 'وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'، ''اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر اُسے موت آ جائے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا، اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے'' (النساء ۴: ۱۰۰)۔ بلاذری کا کہنا ہے کہ اس ارشاد کا حضرت خالد کے بارے میں نازل ہونا ثابت نہیں۔ ابن حجر کہتے ہیں: یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی اور حضرت جندب بن ضمرہ کے سفر ہجرت سے متعلق ہے۔ ابن کثیر نے فیصلہ کیا: یہ آیت مدنی ہے، تاہم اس کا اطلاق حضرت خالد بن حزام کی وفات پر بھی ہو سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت خالد بن حزام کے ہم قبیلہ حضرت زبیر بن عوام مہاجرین حبشہ کے پہلے قافلے کے ساتھ حبشہ پہنچ چکے تھے اور شدت سے حضرت خالد بن حزام کی آمد کے منتظر تھے۔ ان کی وفات کی خبر سن کر بہت دل گرفتہ ہوئے۔ حبشہ میں اس وقت وہ قریش کی شاخ بنو اسد بن عبد العزیٰ کے واحد فرد تھے۔ ہجرت ثانیہ میں بنو اسد بن عبد العزیٰ کے حضرت عمرو بن امیہ، حضرت یزید بن معاویہ اور حضرت اسود بن نوفل نے حضرت خالد بن حزام کے ساتھ سفر کیا اور بخیر و عافیت وہاں پہنچ گئے۔ حضرت یزید جنگ بدر کے بعد اور حضرت اسود جنگ خیبر کے موقع پر مدینہ لوٹ آئے، جب کہ حضرت عمرو نے حبشہ میں وفات پائی اور مسجد نجاشی کے عقب میں واقع صحابہ کے قبرستان میں جگہ پائی۔

ابن اسحٰق اور ابن ہشام نے حضرت خالد بن حزام کو مہاجرین حبشہ میں شمار نہیں کیا۔

کیا ہجرت حبشہ اہل ایمان پر فرض تھی؟

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جنگ بدر کے بعد نازل ہوا، جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ ہجرت فرما کر

دار الاسلام کی بنا رکھ چکے تھے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا. (النساء ۴: ۹۷)

”بے شک، وہ لوگ جن کی روحیں فرشتوں نے اس حال میں سلب کیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، فرشتوں نے پوچھا: تمھارا شمار کن لوگوں میں تھا؟ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں یا مشرکوں کے ساتھیوں میں)، انھوں نے جواب دیا: ہم اس زمین میں بالکل بے بس تھے۔ فرشتوں نے سرزنش کی: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے، سو ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم مکہ کے مسلمانوں تک پہنچایا تو ضعیف العمر حضرت جندع (یا جندب) بن ضمرہ نے اپنے بیٹوں سے کہا: میں ناچار نہیں ہوں، مجھے مدینہ لے چلو۔ ان کے بیٹے ان کو چار پائی پر اٹھا کر چلے تو مکہ کے مضافات میں واقع مقام تنعیم پر پہنچ کر وہ فوت ہو گئے۔ اس کے برعکس، قریش کے نوجوان قیس بن فاکہ، حارث بن زمعہ، قیس بن ولید، ابو العاص بن منبہ (یا منیہ) اور علی بن امیہ جنھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہ کیا تھا اور مکہ ہی میں مقیم تھے، مشرکین انھیں مکانات مسمار کرنے، مال مویشی سلب کرنے کی دھمکی دے کر، فوج کی نفری بڑھانے کے لیے بدر میں گھسیٹ لائے۔ یہ پانچوں غزوۂ بدر میں مارے گئے اور ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے ایمان کے اجر و ثواب سے محروم ٹھیرے۔ ایک روایت کے مطابق یہ اصل میں منافقین تھے۔

عہد نبوی کے اس واقعے سے مشابہت رکھنے کی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن زبیر کے دور حکومت میں حضرت عبد اللہ بن عباس کے آزاد کردہ عکرمہ نے شام یا یمن کی طرف بھیجی جانے والی مہم میں حدیث کے راوی محمد بن عبد الرحمٰن ابو الاسود کو شامل ہونے سے منع کر دیا (بخاری، فتح الباری، رقم ۴۵۹۶۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۰۵۴۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۷۷۴۹)۔ ابن حجر کہتے ہیں: مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں کے اس دور میں دونوں طرف کے مسلمانوں کا خون ناحق بہنا تھا، اس لیے عکرمہ نے سختی سے منع کیا۔

جب دار الاسلام وجود پذیر ہو جائے تو کفار کے ظلم و ستم کا شکار بے بس اور ناچار مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے

کہ وہ دار الکفر سے ہجرت کر کے دار الاسلام منتقل ہو جانے کی سعی کریں۔ وہ لوگ جو ہجرت کی مقدرت رکھتے ہوئے کفار کی محکومیت میں ذلت اور پستی کی زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جائیں، قابل مواخذہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مہاجرین کے لیے ترغیب اور تسلی کا باعث ہے:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. (النحل ۱۶: ۴۱)

”اور جن لوگوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ڈھائے گئے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا مہیا کریں گے اور آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑا ہے، کاش یہ جان لیں۔“

۵ / نبوی میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مظلوم اہل ایمان کو حبشہ ہجرت کرنے کی ہدایت کی، دار الاسلام وجود میں نہ آیا تھا۔ یہ ایک ایسے دار الکفر سے، جہاں دین پر عمل کرنا مشکل تھا، ایک دوسرے دار الکفر کی طرف ہجرت تھی، جہاں فرائض دینیہ پر عمل پیرا ہونے کی آزادی تھی۔ اس لیے یہ ہجرت ہجرت مدینہ کی طرح فرض نہ تھی، تاہم حبشہ کو ہجرت کرنے والے اصحاب 'انبیاے مہاجرین' کی طرح صاحب فضیلت اور اجر عظیم کے مستحق ٹھیرے۔

اہل و عیال

حضرت خالد بن حزام کا بیاہ حضرت زبیر بن عوام کی بہن حضرت ام حبیب بنت عوام سے ہوا۔

کتب رجال سے حضرت خالد بن حزام کے ایک بیٹے عبد اللہ کا نام معلوم ہوتا ہے۔ راویان حدیث ضحاک بن عثمان حزامی اور مغیرہ بن عبد الرحمٰن حزامی عبد اللہ بن خالد کے پوتے تھے۔ حضرت خالد بن حزام کی بیٹی ام الحسن بنت خالد مکہ میں یا حبشہ کے راستے میں پیدا ہوئیں۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، انساب الاشراف (بلاذری)، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل (زمخشری)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، الدر المنثور فی التفسیر الماثور (سیوطی)، Wikipedia۔

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Trusted Name for Last 65 years

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949

Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified ISO 9001 : 2000

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk

Tel: 021-38682810